ٹرین ٹو پاکستان
(ناول)
خوشونت سنگھ

ڈکیتی

1947ء کی گرمی ہندوستان کی دوسری گرمیوں کی طرح نہ تھی۔ یہاں تک کہ موسم بھی اس سال کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ یہ معمول سے ہٹ کر بہت گرم خشک اور گرد آلود تھی ۔ گرمیوں کا یہ عرصہ بہت لمبا ہو گیا تھا۔ چند ہفتوں سے بادلوں نے بھی اپنے سائے پھیلا لیے تھے۔ لیکن بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ گرمی کی شدت کے باعث لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ خدا انہیں ان کے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔

گرمیوں سے پہلے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے سلسلے میں انڈیا کے حامی ہندوؤں اور پاکستان کے حامی مسلمانوں میں فسادات شروع ہو گئے تھے اور کچھ ہی مہینوں میں قتل ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ مسلمان کہتے تھے کہ ہندوؤں نے پلان کے تحت مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا ہے جبکہ دوسری طرف ہندو مسلمانوں پر یہی الزام لگاتے تھے حقیقت میں دونوں طرف ہی قتل ہو رہے تھے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں' دونوں کی طرف سے فائرنگ' چھرے' چاقو' نیزے اور ڈنڈے کا استعمال بھرپور طریقے سے جاری تھا۔

کلکتہ سے لیکر مشرق' مغرب اور شمالی انڈیا تک فسادات پھیلے ہوئے تھے۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں نے ہندوؤں کا قتل عام کر رکھا تھا اور دوسری طرف بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔

مولوی اپنے ساتھ صندوقوں میں انسانی کھوپڑیاں لیے پھرتے اورلوگوں کو بتاتے کہ یہ ان مسلمانوں کی کھوپڑیاں ہیں جو بہار میں قتل ہوئے۔ سینکڑوں ہندو اور سکھ جو صدیوں سے شمالی مغربی سرحدوں پر اکٹھے رہتے تھے اپنی جانیں بچانے کیلئے گھر سے بے گھر کیئے گئے تھے۔

وہ پیدل' بیل گاڑی' چھکڑے' لاریوں اورٹرین کی چھتوں پر سفر کر رہے تھے۔

1947ء کی گری میں ایک نئی ریاست پاکستان کے قیام کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ جس کے بعد ایک کروڑ انسانوں کا سفر شروع ہوا۔ یہ مسلمان' ہندو اور سکھ تھے۔

وقت کے ساتھ مون سون بھی ختم ہوگئی ان ہجرت کرنے والے لوگوں میں سے تقریباً دس لاکھ انسان قتل کر دیئے گئے ان حالات میں نخلستان کا وہ ٹکڑا جہاں امن تھا سرحد کے کنارے واقع بہت سے گاؤں تھے۔ جن میں سے ایک گاؤں منوں مجرا تھا۔منوں مجرا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جس میں تین اینٹوں کی عمارتیں ہیں۔ ایک عمارت دولت مند زمیندار رام لال کا گھر ہے۔ جبکہ دوسری دو عمارتیں سکھ گوردوارہ اور مسجد پر مشتمل ہیں۔ ان تینوں اینٹوں کی عمارتوں کا احاطہ مثلث نما ہے۔ جبکہ ان کے درمیان میں ایک پیپل کا درخت ہے۔

گاؤں کے لوگوں کی رہائش چپٹی چھتوں والے گھر۔ گارے سے بنے ہوئے جھونپڑے اور چھوٹی دیواروں والے صحن پر مشتمل ہے جن کے سامنے تنگ گلیاں روشنی پہنچانے کا باعث ہیں۔

گاؤں کے مغربی کنارے میں ایک تلاب ہے جو کیکر کے درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ منوں مجرا گاؤں میں تقریباً ستر خاندان آباد ہیں جن میں لالہ رام لال واحد ہندو خاندان ہے جبکہ دیگر تعداد مسلمانوں اور سکھوں کی ہے۔ گاؤں کے اردگرد کی ساری زمین سکھوں کی ملکیت ہے جبکہ مسلمان مزارع ہیں اور کاشت کاری میں زمینداروں کے ساتھ ان کی حصے داری ہے۔ یہاں پر چند خاندان خاکروبوں کے بھی آباد ہیں جن کے بارے میں لوگوں کو زیادہ علم نہیں لیکن مسلمان ان پر اپنی ملکیت کا دعوٰی کرتے ہیں اور انہیں مسلمان قرار دیتے ہیں۔

جب امریکی عیسائی مبلغوں نے منوں مجرا کا دورہ کیا تو اس وقت ان خاکروبوں نے خاکی رنگ کی مخصوص ٹوپیاں پہن کر مبلغوں کی خواتین کے ساتھ لوک گیت میں شامل ہو کر ہارمونیم کی دھن میں خدا کی حمد پڑھی۔ کبھی کبھی وہ سکھوں کے گوردوارے بھی جاتے لیکن ان کے دورے کا بنیادی مقصد منوں مجرا کے تمام لوگوں کو یہاں تک کہ لالہ رام لال کو بھی قابل احترام سمجھنا ہے۔

تالاب کے ساتھ کیکر کے درخت کے نیچے دائیں طرف تین فٹ اونچی ریتلے پتھر کی ایک سل ہے جو کہ ایک مقامی دیوتا کی ہے۔ گاؤں والوں کو جب کوئی خاص دعا قبول کروانی ہو تو تمام گاؤں والے ہندو' سکھ' مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے چھپ کر اس کی مرمت کرتے۔ اگرچہ منوں مجرا دریائے ستلج کے کنارے واقع ہے لیکن یہ گاؤں دریا سے تقریبا آدھا میل دور ہے۔ انڈیا میں گاؤں کا دریاؤں کے کنارے آباد ہونا آسان نہیں ہے کیونکہ موسم کے ساتھ دریاؤں کا رخ بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور ان کی رفتار بھی اچانک بڑھ جاتی ہے۔

ستلج پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے۔ مون سون کے بعد اس کا پانی اوپر کو اٹھتا ہے اور اس کی ریت کا وسیع بستر زمین پر پھیل جاتا ہے۔ اور دریا کے بند کی ساری گیلی مٹی کو لپیٹ لیتا ہے۔

جب چاروں طرف سے سیلاب امنڈتا ہے تو دریا ٹوٹ کر سینکڑوں چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی ہوا دلدل والے جزیرے میں سستی سے چلتی رہتی ہے۔

یہ ایک شاندار پل ہے اس کے اٹھارہ خوبصورت پل لہروں کی طرح ایک ستون سے دوسرے تک جاتے ہیں۔ ان سب کے آخر میں دریا کے کنارے کا پتھر ریلوے لائن کیلئے بند باندھتا ہے۔

منوں مجرا ہمیشہ سے اپنے ریلوے اسٹیشن کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ اس وقت سے یہ پل ہی ایک واحد راستہ ہے۔ اس راستے کو اہم بنانے کی خاطر وہاں ٹرین زیادہ دیر رکتی ہے۔ اسٹیشن کے اردگرد ایک چھوٹی سی کالونی ہے جو کہ دکانداروں اور چھابڑی فروشوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ مسافروں کو کھانا ' پان' سگریٹ' چائے' بسکٹ اور ٹافی گولی فراہم

کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اسٹیشن پر رونق کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر
موجود اسٹیشن ماسٹر اپنے آفس میں چھوٹی سی جگہ پر بیٹھ کر خود ٹکٹ بیچتا اور دروازے کی پچھلی
طرف سے ان سے پیسے وصول کرتا وہ ٹیلی گراف کے ذریعے پیغامات بھی بھیجتا اور وصول
کرتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی اور لوگ کہتے تو وہ پلیٹ فارم پر آ کر آنے والی ٹرین کیلئے
سبز جھنڈی بھی لہراتا۔ جو عموماً یہاں رکتی نہیں تھی۔

اس کا اکلوتا نائب بڑی چابکدستی سے پلیٹ فارم کے معمولی سے کنٹرول روم
سے چاروں طرف کے سگنل کو کنٹرول کرتا۔ شام کو وہ پلیٹ فارم پر تیل کے لیمپ کے
ذریعے روشنی کرتا۔ وہ سگنل دینے کیلئے ایلومینیم کے بھاری لیمپ اٹھائے ہوتا تھا۔ جس کے
پیچھے سبز اور سرخ شیشہ تھا۔ صبح کو وہ ان (لیمپوں) کو واپس لا کر پلیٹ فارم پر رکھ دیتا۔
منوں مجرا میں بہت کم گاڑیاں رکتی تھیں۔ ایکسپریس ٹرین تو بالکل بھی نہ رکتی۔ بہت سی
سست رفتار مسافر ٹرینیں اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق چند منٹ کیلئے صبح کے وقت دہلی سے
لاہور اور شام میں لاہور سے دہلی جاتے ہوئے رکتی تھیں۔ البتہ مال گاڑیاں یہاں ضرور
رکتی تھی۔ منوں مجرا میں کبھی کبھار ہی بھیجنے اور وصول کرنے کیلئے سامان ہوتا تھا عموماً اس کی
ریل کی پٹڑیوں پر ویگنیں قابض ہوتیں۔ گزرنے والی ہر مال گاڑی ویگنیں ہٹانے اور
دوسری چیزیں اکٹھے کرنے میں گھنٹوں صرف کر دیتی۔ رات کو جب کہ سارا ملک خاموشی
کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوتا تو ساری رات انجن کی سیٹی اور چھک چھک کی آواز اور لوہے کی
جھنکار سنی جا سکتی تھی۔ ان سب چیزوں نے منوں مجرا کو ٹرین کے بارے میں بہت باخبر کر
دیا تھا۔

دن ختم ہونے سے پہلے میل ٹرین بہت تیزی سے اپنے راستے پر لاہور کی طرف
روانہ ہوتی اور جب وہ پل پر پہنچتی تو ڈرائیور زور سے سیٹی بجاتا۔

اسی طرح صبح گزرنے والی ٹرین کی آواز سے سارا منوں مجرا جاگ جاتا۔ کوے
کیکر کے درخت پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنا شروع کر دیتے جبکہ چمگادڑ واپس اپنے نئے
لیکن خاموش ٹھکانوں کی طرف اڑ جاتے۔ مسجد کے مؤذن جانتے ہیں کہ یہ وقت ان کی صبح
کی نماز کا ہے۔ وہ جلدی سے وضو کرتے کعبہ کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں اذان

دیتا شروع کر دیتے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ جب تک مؤذن کی آواز گونجتی رہتی سکھ
گردوارے کے گرنتھی اپنے بستروں میں گھسے رہتے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر گردوارے
کے صحن میں موجود کنوئیں میں بالٹی ڈال کر پانی نکالتے اور پانی کی چھپ چھپ کی آواز
میں اپنی پوجا کرتے ہوئے اکتا دینے والا گیت گاتے۔

تقریباً ساڑھے دس بجے صبح پسنجر ٹرین دہلی سے آتی اس کے ساتھ ہی منوں مجرا
میں زندگی رواں دواں ہو جاتی۔ مرد کھیتوں میں اور عورتیں اپنے روز کے گھریلو کام میں
مصروف ہو جاتیں۔ جبکہ بچے مویشیوں کو دریا کے کنارے چرانے لے جاتے۔ چڑیاں
چھتوں پر سے اڑتے ہوئے اپنی چونچ میں تنکے اکٹھے کرتیں۔ آوارہ کتے مٹی کی اونچی
دیواروں کے سائے تلاش کرتے۔ چمگادڑ اپنے پروں کو سمیٹ کر سونے کی تیاری کرتے۔
جیسے ہی دوپہر نمودار ہوتی منوں مجرا کی مچلتی زندگی کو سکون میسر آ جاتا۔ مرد اور بچے شام
کے کھانے کیلئے گھروں کو لوٹ جاتے اور کھانے کے بعد قیلولہ کرتے۔ جب وہ سب کھانا
کھا چکتے تو تمام مرد پیپل کے درخت کے نیچے لکڑی کے تختے پر بیٹھ کر باتیں شروع کر
دیتے۔

لڑکے اپنی بھینسوں پر سوار ہو کر یا ان کی پیٹھ کے پچھلے حصے پر کھڑے ہو کر جوہڑ
میں چھلانگیں لگاتے اور جوہڑ کے گدلے پانی میں چھپ چھپ کرتے لڑکیاں درختوں کے
نیچے کھیلتیں۔ خواتین ایک ایک بال میں رگڑ رگڑ کر مکھن لگا کر اپنے بچوں کے سر میں سے
جوئیں نکالتیں وہ زیادہ تر شادی اور مرنے جینے کی باتیں کرتیں۔

جب شام کو لاہور سے آنے والی مسافر ٹرین آتی تو ہر کوئی دوبارہ سے کام کیلئے
تیار ہو جاتا۔ مویشی گھوم پھر کر گھر لوٹ آتے ہیں انہیں دودھ دھونے کیلئے اور رات کیلئے
باندھ دیا جاتا۔ جبکہ عورتیں رات کیلئے کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتیں اس کے بعد تمام
خاندان اپنی چھتوں پر اکٹھے ہو جاتے ان میں سے اکثر گرمیوں میں چھتوں پر سوتے ہیں۔
یہ لوگ اپنی چارپائیوں پر بیٹھ کر مزے دار سبزیاں اور چپاتی کھاتے اور ساتھ میں گرم گرم
کریم والا دودھ پیتے اور جب تک ان کے سونے کا سگنل نہیں بجتا وقت کو بیکار ضائع
کرتے رہتے۔

جب مال گاڑی دھواں چھوڑتی ہے تو وہ سب ایک دوسرے سے کہتے ہیں وہ دیکھو وہاں مال گاڑی ہے۔ حقیقت میں ان کہنے کا یہ مقصد ہوتا تھا کہ خدا حافظ۔

مئوذن دوبارہ سے اونچی آواز میں اذان دینا شروع کر دیتے ۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

اس آواز پر تمام ایمان والے اپنی چھتوں سے آمین کہتے۔ کوے کیکر کے درخت پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ سے کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں۔ مال گاڑی اسٹیشن پر انجن کے تیار ہونے اور ویگنوں کے پٹڑی سے ہٹنے تک۔ طویل وقت گزارتی اور جب وہ روانہ ہوتی تو بچے سو جاتے جبکہ بوڑھے بھی اس بات کا انتظار کرتے رہتے کہ گاڑی پل پر سے گزر جائے تاکہ بعد میں ان کی نیند خراب نہ ہو۔ اس کے بعد منوں مجرا کی زندگی کو سکون مل جاتا اور رات کو گزرنے والی ٹرین پر بھونکنے والے کتوں کو بھی آرام مل جاتا۔

اسی سال اگست کی ایک گرم رات میں پانچ آدمی کیکر کے درختوں کے جھنڈ میں سے برآمد ہوئے جو کہ منوں مجرا سے زیادہ دور نہیں۔ وہ پانچوں خاموشی سے دریا کی طرف چل دیئے۔ وہ ڈاکو اور پیشہ ور لٹیرے تھے ان میں سے ہر ایک کے پاس اسلحہ تھا۔ ڈاکو نیزے برچھی بھی اٹھائے ہوئے تھے جبکہ دو نے اپنے کاندھوں پر ریوالور لٹکائے ہوئے تھے اور پانچویں آدمی نے کروم فولاد کی بنی ہوئی ٹارچ پکڑی ہوئی تھی۔ جب وہ دریا کے کنارے پہنچےتو ایک نے ٹارچ جلائی اس نے ادھر ادھر دیکھ کر غصے سے کہا۔

''ہم یہاں انتظار کریں گے۔''

وہ ریت پر لیٹ گیا جبکہ دوسرے ساتھی اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ٹارچ والے ڈاکو نے اپنے ایک ساتھی ڈاکو کے چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے پوچھا۔''کیا تم جگا کیلئے چوڑیاں لے آئے ہو۔''

ہاں میں ایک درجن سرخ اور نیلی کانچ کی چوڑیاں وہ گاؤں کی کسی بھی کنواری خوبصورت لڑکی کو خوش کر سکتے ہیں۔''ایک ڈاکو نے معنی خیز انداز مین کہا۔ یہ سن کر سردار ہنس دیا۔ ٹارچ والے نے ٹارچ کو لاپرواہی سے ہوا میں اچھالا اور پکڑ لیا۔ وہ دوبارہ ہنسا اور ٹرچ اس کے منہ کی طرف بڑھا کر اس کا بٹن دبا دیا۔ اس کے گال ٹارچ کی روشنی میں

گلابی ہو گئے۔ ایک دوسرے مسلح ڈاکو نے کہا۔ کیا جگا یہ چوڑیاں اس جولاہے کی بیٹی کو دے دے گا؟

''اس لڑکی کا کیا نام ہے؟'' سردار نے ٹارچ اس کے منہ پر سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''نوراں''

کیا تم نے اسے میلے میں دیکھا تھا؟ اور کیا تم نے اس کی تنگ قمیض میں سے باہر نکلتی ہوئی چھاتی دیکھی تھی؟''

ایک بندوق والا جواب تک چپ تھا۔ بولا۔'' وہ جگا کا بہت اچھا وقت گزارتی ہو گی۔''

دن میں وہ اتنی معصوم لگتی ہے کہ تم دیکھ کر یہ سوچو گے کہ ابھی تو اس نے اپنے دودھ کے دانت بھی نہیں نکالے ہیں۔ ایک بولا' دوسرے نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
لیکن رات کو وہ اپنی آنکھوں میں کالا سرمہ ڈالتی ہے۔ اف۔

سرمہ آنکھوں کیلئے بہت مفید ہے۔ ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔
ان میں سے کسی نے جواب دیا۔

یہ دوسروں کی آنکھوں کیلئے بھی اتنا ہی مفید ہے اور ان کے غصے کو بھی ٹھنڈا کرتا ہے۔ انکا سردار زور سے چیخا۔ جگا!

سب ڈاکو ہنس دیئے۔ اچانک ان میں سے ایک سیدھا بیٹھ گیا۔ اور بولا۔
خاموش ہو جاؤ اور سنو وہ مال گاڑی آ رہی ہے۔

سب نے ہنسنا بند کر دیا۔ انہوں نے خاموشی اور سناٹے میں ٹرین کے آنے کی آواز سنی۔ وہ رک رک کر چھک چھک کرتی آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ویگنوں کو گھسیٹتی ہوئی ٹرین کے انجن کی اوپر نیچے ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔

سردار نے کہا۔ یہی وقت ہے رام لال کو بلانے اور اسے پکڑنے کا سردار کے ساتھی اپنے کپڑوں پر سے ریت جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر ایک لائن کی صورت میں جوڑتے ہوئے دعا

کی۔ ان میں سے ایک آگے کھڑا ہو گیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔

دعا ختم ہونے کے بعد سب لوگ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گئے اور زمین پر اپنی پیشانی کو لگا کر سجدہ کیا۔

اس کے بعد ان سب نے کھڑے ہو کر اپنی پگڑی کے آخری حصے سے چہرے کو چھپا لیا۔ صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ انجن نے دو سگنل دیئے اور ٹرین نے پل کی طرف حرکت شروع کر دی۔ سردار نے کہا۔ چلو۔ اور سب دریا کے کنارے تک اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ٹرین اپنے وقت پر پل پر پہنچ چکی تھی۔ وہ سب جوہڑ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے گلی تک آ گئے جو کہ گاؤں کے بیچ میں سے گزرتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لالہ رام لال کے گھر پہنچ گئے۔

سردار نے ایک مسلح شخص کو اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھا اور اس نے بندوق کے پچھلے حصے سے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

ڈاکو چلایا۔ ''لالہ!''

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ گاؤں کے کتے مہمانوں کے اردگرد جمع ہو گئے اور ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے اپنے نیزہ سے کتے کو مارا جبکہ دوسرے نے ہوا میں گولی چلائی۔

کتے خوفزدہ ہو کر دور بھاگ گئے اور دور کھڑے ہو کر دوبارہ سے ان پر بھونکنے لگے۔

انہوں نے اپنی بندوق کے ذریعے دروازے کو دوبارہ کھٹکھٹایا۔'' دروازہ کھول کتے کی اولاد۔ ہم تجھے مار دیں گے۔'' وہ چلایا۔

جواب میں ایک عورت کی آواز آئی۔ کون ہے؟ کون اس وقت آواز دے رہا ہے۔ لالہ جی شہر گئے ہوئے ہیں۔

سردار نے چلا کر کہا۔'' دروازہ کھولو ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ورنہ

ہم دروازہ توڑ دیں گے۔''

''میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ لالہ جی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ چابیاں بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ہمارے پاس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' ڈاکوؤں نے اپنے کندھے دروازے پر زور زور سے مارنے شروع کر دیئے۔ لکڑی کا دروازہ دوسری طرف سے چیخ کر کھل گیا ان میں سے ایک دروازے پر کھڑا رہا جبکہ باقی چار اندر داخل ہو گئے۔

کمرے کے ایک کونے میں دو عورتیں بیٹھی تھیں جبکہ ایک سات سال کا لڑکا اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں کے ساتھ ان عورتوں کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

خدا کیلئے جو کچھ ہمارے پاس ہے سب لے جاؤ۔ ہمارا سارا زیور' سب کچھ' بوڑھی عورت نے خوف سے چیختے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ میں سونے اور پیتل کے زیورات پکڑ رکھے تھے۔

ایک آدمی نے اس کے ہاتھوں سے وہ سب کچھ چھین لیا۔'' لالہ کہاں ہے؟''

''میں گرو کی قسم کھا کر کہتی ہوں وہ باہر ہے ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ تم لے چکے ہو۔ لالہ جی کے پاس دینے کیلئے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

صحن میں چار بستر ایک ترتیب سے بچھے ہوئے تھے۔ آدمی نے اپنے ریوالور کے ذریعے اس سات سالہ لڑکے کو اس کی دادی کی پکڑ سے کھینچا۔ اور بندوق سے اس بچے کے چہرے پر نشانہ باندھ لیا۔ یہ دیکھ کر عورتیں اس کے پاؤں پر گر پڑیں بھائی! اسے مت مارو۔ گرو کی خاطر اسے مت مارو۔ مسلح شخص نے عورت کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔

تیرا باپ کہاں ہے؟

بچے نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ سیڑھیوں کے اوپر مسلح شخص نے اس بچے کو دوبارہ اس کی دادی کی طرف پھینک دیا۔ وہ لوگ صحن میں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھے چھت پر صرف ایک ہی کمرہ تھا۔

بغیر کھٹکھٹائے انہوں نے دروازے کو کندھے سے دھکا دے کر کھول لیا۔

کمرے میں اسٹیل کے ٹرنک بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں پر دو چارپائیاں تھیں جن پر بہت سی رضائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

ٹارچ کی سفید روشنی نے کمرے کو تلاش کرنا شروع کیا اور جلد ہی اس زمیندار کو ایک چارپائی کے نیچے سے ڈھونڈ لیا۔ لالہ جی چارپائی کے نیچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔ گرو کے نام پر لالہ جی باہر آ جائیں۔ پھر اس نے ٹانگوں سے پکڑ کر لالہ جی کو باہر کھینچا۔ سردار نے اس زمیندار کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور طنزاً کہا لالہ جی کیا آپ اپنے مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ چارپائی کے نیچے چھپ رہے ہیں۔

رام لال نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا اور ریں ریں کر کے رونا شروع کر دیا۔

سردار نے لالہ رام جی کی پیٹھ پر مارتے ہوئے پوچھا۔ ''سیف کی چابی کہاں ہے؟''

زمیندار نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سردار کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم سارا زیور نقد روپیہ اور اکاؤنٹ بک لے جاؤ لیکن ہم میں سے کسی کو مت مارو۔''

سردار نے دوبارہ کہا۔ ''سیف کی چابی کہاں ہے؟''

اس نے دوبارہ زمیندار کو ٹھوکر ماری جو کہ زمین پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ خوف سے مسلسل کانپ رہا تھا۔ زمیندار نے اپنی جیب سے نوٹ نکالے اور کہا ''یہ پانچوں آپس میں بانٹ لو۔ میرے پاس گھر میں یہی کچھ ہے۔ سب تمہارا ہے۔'' ''تمہارے سیف کی چابی کہاں ہے؟ ایک نے پوچھا۔ سیف میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔'' زمیندار نے کہا۔ صرف میری اکاؤنٹ بک ہے میں تمہیں سب کچھ دے چکا ہوں گرو کے نام پر مجھے بخش دو۔

زمیندار نے سردار کی ٹانگوں کو پکڑ لیا اور سسکیاں بھرنا شروع کر دیں۔ ''گرو کے نام پر۔ گرو کے نام پر مجھے چھوڑ دو۔''

ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر زمیندار کو سردار کے پاس سے ہٹایا اور اپنی بندوق کا بٹ زور سے زمیندار کے چہرے پر مارا۔

رام لال کے چہرے سے خون بہنے لگا وہ اور زور زور سے رونے لگا عورتیں صحن

میں سے چیخوں کی آواز سن رہی تھیں۔ انہوں نے چلانا شروع کر دیا۔ ڈاکو۔ ڈاکو۔ ہر طرف کتے بھونکنے لگے، لیکن کوئی بھی گاؤں والا اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا۔

اپنے گھر کی چھت پر زمیندار بندوق کے بٹوں اور نیزے سے مار کھا رہا تھا۔ وہ اپنے کولہوں کے بل بیٹھا چیخ رہا تھا اور خون تھوک رہا تھا۔ اس کے دو دانت بھی ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی سیف کی چابیاں نہیں دے رہا تھا۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر ان میں سے ایک آدمی ہنسنے لگا۔

تمام لوگ باہر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے ہوائی فائرنگ کی جس پر عورتوں نے چیخنا اور کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ یوں گاؤں میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

ڈاکوؤں نے چھت پر سے باہر گلی میں چھلانگ لگائی اور بڑھکیں مارنے لگے۔ آؤ باہر آؤ۔ اگر تم میں ہمت ہے۔ اگر تم اپنی ماں بہنوں کی آبرو ریزی کروانا چاہتے ہو تو باہر آؤ۔

کہیں سے انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ منوں مجرا میں بالکل خاموشی تھی۔ ڈاکو گلی میں مسلسل چلتے ہوئے چیختے اور ہنستے رہے۔۔ وہ بڑھکیں مار رہے تھے یہاں تک کہ وہ گاؤں کے آخر میں ایک چھوٹی جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر رکنے کے بعد سردار نے اپنے ایک مسلح ساتھی کو اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اس بدمعاش جگا کا گھر ہے۔

۔سردار نے کہا ''ہمیں اپنا تحفہ بھولنا نہیں چاہیے۔ اور اسے چوڑیوں کا تحفہ دینا چاہیے۔''

ایک مسلح آدمی نے اپنے کپڑوں میں سے ایک پیکٹ نکالا اور دیوار کے اوپر سے صحن میں پھینک دیا۔ بہت سی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

''اوئے جگے!'' ''اس نے طنزاً کہا۔ اس نے اپنے ساتھی کو آنکھ مارتے ہوئے دوبارہ کہا۔ جگے یہ چوڑیاں پہن لے اور اپنے ہاتھوں پر مہندی لگا لے۔''

یا پھر اسے کسی جولاہے کی بیٹی کو دے دو۔ ایک مسلح شخص نے چیخ کر کہا۔ وہ دریا کی طرف جاتے ہوئے مسلسل ہنستے رہے۔ جگت سنگھ نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں

دیا۔ اس نے ان کی کوئی بات نہیں سنی تھی کیونکہ وہ گھر پر نہیں تھا۔

جگت سنگھ اپنے گھر سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کہیں گیا تھا۔ وہ اس وقت گھر چھوڑ چکا تھا جب رات کو آنے والی مال گاڑی نے اسے اس بات کی اطلاع دی تھی کہ باہر جانے میں اسے کوئی خطرہ نہیں۔

جب اسے رات کو گاڑی کے پہنچنے کی آواز آئی تو وہ اپنی چارپائی سے خاموشی سے اٹھا اور اپنی پگڑی اٹھا کر سر پر باندھ لی۔ پھر وہ آہستہ سے صحن میں رکھی سوکھی گھاس پر سے گزرتا ہے۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے بستر پر آتا ہے اور خاموشی سے اپنے جوتے اٹھا کر دروازے کی جانے لگتا ہے تو اس کی ماں کی آواز آتی ہے۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

ماں کی آواز سن کر جگت سنگھ رک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کھیتوں کی طرف جا رہا ہوں کیونکہ کل رات جنگلی سور نے فصل کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔

سور' ''ماں نے طنزیہ انداز میں کہا'' زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ کیا تم بھول چکے ہو کہ تم آزمائشی مدت میں ہو۔ اور پولیس کی اجازت کے بغیر سورج غروب ہونے کے بعد تم گاؤں سے باہر نہیں جا سکتے۔ تمہارے دشمن تمہاری گھات میں بیٹھے ہیں اور وہ تم پر حملہ کر دیں گے۔ تمہاری رپورٹ بھی کر دیں گے اور تمہیں دوبارہ جیل بھیج دیں گے۔ اس کی ماں کی درد بھری آواز گونجتی ہے۔

جگت سنگھ نے جواباً کہا۔ ''میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ سارا گاؤں سو رہا ہے اس کی ماں نے ایک مرتبہ پھر درد بھری آواز میں اسے روکا۔ جگت سنگھ نے ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو جاؤ۔ تم ضرور ہمسایوں کو جگاؤ گی۔'' چپ ہو جاؤ اور کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر دینا۔'' جگت سنگھ کی یہ بات سن کر اس کی ماں نے غصے سے کہا جا'' جہاں تو جانا چاہتا ہے جا۔ اگر تو کنویں میں چھلانگ لگانا چاہتا ہے تو لگا لے۔ اگر تو اپنے باپ کی طرح پھانسی چڑھنا چاہتا ہے تو چڑھ جا میری قسمت ہی خراب ہے۔'' اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میری قسمت میں رونا لکھا ہے۔''

جگت سنگھ نے دروازہ کھولا اور دونوں طرف گردن گھما کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی

نہیں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گلی کے نکڑ پر کنویں کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اب بھورے رنگ کے لق لق جانور کو دیکھ سکتا تھا جو کہ کنویں کے قریب مٹی میں سے مینڈک تلاش کر رہے تھے۔ جگت سنگھ دیوار کے پاس اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ لق لق چلے نہیں گئے تھے۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر سے ہوتا ہوا اور کھیتوں میں سے گزرتا ہوا دریا کی طرف چل دیا۔ جگت سنگھ خشک ریت کے بستر کو روندتا ہوا ندی کے قریب پہنچ گیا اور زمین پر لیٹ کر ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

نیلے آسمان تلے سرمئی راستوں پر کہکشاں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ اچانک ہی نرم و نازک ہاتھوں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

''بوجھو کون؟''

جگت سنگھ نے اس کے ہاتھ اپنے سر پہ سے کھینچے اور اپنے پیچھے کر دیئے۔ ہاتھوں سے ٹٹولا۔ لیکن لڑکی نے اسے دھوکہ دے دیا۔

جگت سنگھ نے اس کے ہاتھوں سے محسوس کرنا شروع کیا اور بازو سے ہوتا ہوا کاندھے تک گیا پھر اس کے چہرے پر پہنچ گیا۔ جگت سنگھ نے اس کے گال' آنکھوں اور ناک کو پیار سے بوسہ دیا۔ جگت سنگھ نے لڑکی کے ہونٹوں سے کھیلنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ہونٹ انگلیوں کو چوم لیں لڑکی نے اپنا منہ کھول کر اس کی انگلیوں کو زور سے کاٹا جگت سنگھ نے جلدی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

جگت سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کا سر پکڑ لیا اور اس کا چہرہ اپنے قریب لے آیا۔

پھر اس نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اپنے بازوؤں میں لیکر اسے اوپر اٹھا لیا جس طرح کہ ایک کیکڑا اپنی ٹانگوں میں کسی چیز کو دبوچتا ہے۔ جگت سنگھ نے لڑکی کو اس وقت تک اٹھائے رکھا جب تک کہ اس کے بازوؤں نے جواب نہ دے دیا۔ اس نے آہستہ آہستہ لڑکی کو بازوؤں سے نیچے اتارا۔ لڑکی نے اس کے منہ پر ایک ہلکا تھپڑ لگا دیا۔ ''تم نے ایک پردیسی عورت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ کیا تمہارے گھر کوئی ماں بہن نہیں۔ کیا تمہیں کوئی شرم نہیں؟ پولیس کے رجسٹر میں تم ایک برے کردار کے انسان ہو۔ میں ابھی

انسپکٹر صاحب کو رپورٹ کروں گے کہ تم ایک بدمعاش ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"میں صرف تیرے لیے بدمعاش ہوں۔" نورو' ہم دونوں کو ایک ہی قید خانے میں بند ہونا چاہیے۔" جگت سنگھ نے کہا۔

"تجھے بہت باتیں بنانی آ گئی ہیں۔ مجھے کوئی اور آدمی دیکھنا ہو گا۔" نوراں بولی۔

جگت سنگھ نے نورو کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ اور اتنی زور سے اسے دبایا کہ اس کیلئے بولنا اور سانس لینا مشکل ہو گیا۔

ہر دفعہ جب بھی وہ بولنا شروع کرتی جگت سنگھ اس کے بازو اس کے پیچھے کر دیتا اور اس کے الفاظ اس کے حلق ہی میں رک جاتے۔ وہ اسے اپنے قریب لٹانےمیں کامیاب ہو گیا اور اس کا سر اپنے بائیں بازو کے حلقے میں رکھ لیا اور اپنے دائیں ہاتھ سے وہ اس کے چہرے اور بالوں کو سہلانے لگا۔ مال گاڑی کے انجن نے دو دفعہ سیٹی بجائی اور بہت زیادہ بوجھ کی وجہ سے کراہتے ہوئے چھک چھک کرتی پل کے راستے پر چل دی۔

جوہڑ سے تمام بگلے کراک کراک کرتے ہوئے دریا کی طرف اڑ گئے۔ جب مال گاڑی پل پر سے گزر گئی اور اس کی چھک چھک کی آواز بھی رات کے سناٹے میں دم توڑ گئی تو تمام بگلے دوبارہ دریا سے جوہڑ کی جانب لوٹ آئے۔ جگت سنگھ کی محبت نے دوبارہ جوش مارا اس کا ہاتھ نورو کے چہرے سے ہوتا ہوا اس کی چھاتی اور کمر تک پہنچ گیا لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ چہرے پر رکھ دیا اس کی سانس آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔ اس کا ہاتھ دوبارہ سے اٹھتا ہوا لڑکی کی چھاتی کو چھونے لگا جیسے کہ یہ غلطی سے ہوا ہو۔ لڑکی نے ہاتھ پر ایک چپت لگائی اور پرے ہٹا دیا۔

جگت سنگھ نے اپنا بایاں بازو جو کہ لڑکی کے سر کے نیچے تھا کھینچ لیا۔ اور اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جو کہ وہ اپنی مدافعت کیلئے استعمال کر رہی تھی۔ جبکہ اس کا دوسرا بازو پہلے ہی جگت سنگھ کے نیچے تھا۔ وہ اب کمزور پڑ چکی تھی۔ نہیں' نہیں' نہیں چھوڑو یہ میرا ہاتھ نہیں۔ اب میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ نورو نے کہا۔

اس نے جگت سنگھ کی ہوس سے بچنے کیلئے اپنے سر کو زور زور سے ادھر ادھر ہلانا

شروع کر دیا۔ جگت سنگھ نے اپنا ہاتھ اس کی قمیض میں ڈال دیا اور اس کی چھاتی کے دونوں ابھاروں پر پھیرنا شروع کر دیا۔ اس کی چھاتی مزید ابھر گئی۔ چھاتی کے نپل چمڑے کی مانند سخت ہو گئے۔ اس کے کھردرے ہاتھ آہستہ آہستہ نرمی سے چھاتی کو اوپر نیچے کرتے ہوئے ناف تک پہنچ گئے۔ نورو کے پیٹ کی کھال نفسانی خواہش کیلئے تیار ہو گئی۔ لیکن وہ مسلسل اپنے بچاؤ کیلئے بل کھا رہی تھی نہیں نہیں' نہیں۔ ابھی نہیں۔ خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔ اگر تم نے آئندہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیا تو میں تم سے کبھی ملنے نہیں آؤں گی۔ جگت سنگھ کا ہاتھ ریڑھ کی ہڈی سے ہوتا ہوا پاجامے تک پہنچ گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسے کھینچا۔

نہیں۔ لڑکی نے بیٹھی ہوئی خوفزدہ آواز میں کہا رات کو کہیں سے گولی چلنے کی آواز آئی۔

بگلے جوہڑ پر سے اڑ گئے۔ کوے کیکر کے درخت پر سے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے۔

جگت سنگھ رک گیا اور گاؤں کی طرف اندھیرے میں دیکھنے لگا۔

لڑکی نے جلدی سے اپنے آپ کو اس کی پکڑ سے چھڑایا اور اپنے کپڑے درست کرنے لگی۔ کچھ دیر میں کوے واپس درختوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ بگلے بھی دریا کے پار سے اڑ گئے۔ صرف کتے بھونکتے رہے۔ نورو نے گھبراتے ہوئے کہا۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی؟

جگت سنگھ خاموش رہا۔ اس نے اپنے آپ کو جگت سنگھ کی دوبارہ ابھرتی محبت سے بچانے کیلئے پھر کہا۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ "یہ آواز گاؤں کی طرف سے نہیں آئی تھی؟" "میں نہیں جانتا۔ تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ سب کچھ ٹھیک ہے۔"

جگت سنگھ نے دوبارہ اسے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ گاؤں میں کوئی قتل ہوا ہے میرا باپ جاگ جائے گا اور یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ میں کہاں گئی تھی۔ مجھے فوراً گھر واپس جانا چاہیے۔" لڑکی نے کہا "نہیں تم نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم کہہ دینا کہ تم اپنی سہیلی کے ساتھ تھیں۔"

بے وقوف کسانوں جیسی باتیں مت کرو۔

جگت سنگھ نے اس کا منہ بند کر دیا اور اپنا بھاری بوجھ اس پر ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بازو چھڑواتی اس نے ایک دفعہ پھر زور سے اس کا پاجامہ کھینچا۔

مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔

وہ جگت سنگھ کی طاقت کے آگے کوئی مزاحمت نہ کر سکی۔ شاید وہ خود بھی ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دنیا سانسوں کی ردھم اور گرم سانسوں کی خوشبو میں گم ہو گئی۔

جگت سنگھ کے ہونٹ لڑکی کی آنکھوں اور گالوں کو چومنے لگے۔ اس نے اپنی زبان سے اس کے کان کو چاٹا۔ ہیجان کے اس عالم میں لڑکی نے اپنے ناخن اس کی باریک داڑھی والے گالوں میں گاڑ دیئے اور اس کی ناک کو کاٹ لیا۔

تمام ستارے گھومتے چلے گئے اور اپنی جگہ پر اس طرح واپس آئے جیسے افقی جھولا آہستہ آہستہ گھومتا ہوا رکتا ہے۔ زندگی پھر سے اپنی روانی میں آ گئی۔ آج اس نے ایک زندہ انسان کے بوجھ کو محسوس کیا۔

ریت اس کے بالوں میں گھس رہی تھی جبکہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کی ننگی ٹانگوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ان گنت ستارے اسے تنقیدی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اس نے جگت سنگھ کو پرے دھکا دیا۔ وہ اس کے نزدیک ہی لیٹ گیا۔

''تم یہی سب کچھ چاہتے تھے۔ اور تم نے یہ حاصل بھی کر لیا۔ تم صرف ایک کسان ہو جو ہر وقت اپنا بیج بونا چاہتا ہے۔ چاہے دنیا جہنم میں جائے تم بس یہی کرنا چاہو گے۔ چاہے گاؤں میں بندوقیں ہی کیوں نہ چل پڑیں۔'' نورو نے اسے شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے بندوق سے کوئی گولی نہیں چلائی۔ یہ صرف تمہارا وہم ہے۔'' جگت سنگھ نے نورو کی طرف دیکھے بغیر تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

دریا کی طرف سے آہستہ آہستہ بھیانک آوازیں آ رہی تھیں۔ دونوں یہ آوازیں سننے کیلئے بیٹھ گئے دو گولیوں کے چلنے کی آواز یکے بعد دیگرے آئیں۔ کوے کیکر کے درخت پر سے اڑتے ہوئے کائیں کائیں کرنے لگے نورا نے رونا شروع کر دیا۔

گاؤں میں ضرور کچھ ہوا ہے۔ میرا باپ جاگ گیا ہو گا اور اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ میں گھر سے باہر گئی ہوئی ہوں۔ وہ مجھے مار دے گا۔ جگت سنگھ اس کی کوئی بات نہیں سن

رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

اگر لوگوں کو گاؤں سے اس کی غیر موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ پولیس کے سامنے مشکل میں پڑ جائے گا۔

یہ سب کچھ اس کیلئے اتنی پریشانی کی بات نہیں تھی جتنی کہ نورو کو مشکل اور پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اب تم سے ملنے کبھی نہیں آؤں گی۔

''اللہ مجھے اس دفعہ معاف کر دے۔ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔''

''تو چپ کرے گی یا میں تیرے چہرے کو پھر سے چاٹوں۔'' جگت سنگھ نے کہا۔ نورو نے رونا شروع کر دیا۔

اس کیلئے اس بات کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی آدمی ہے جو کچھ لمحے پہلے اس پر محبت نچھاور کر رہا تھا۔

''چپ کرو۔ کوئی آ رہا ہے۔'' جگت سنگھ نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

دونوں خاموشی سے لیٹے رہے اور اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگے پانچوں آدمیوں نے بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اور نیزے ان دونوں سے کچھ گز کے فاصلے پر سے گزرے۔

انہوں نے اپنے منہ چھپائے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے ڈاکو! کیا تم انہیں جانتے ہو۔ نورو نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ٹارچ والا مالی ہے۔ اس کے اپنی بہن سے جنسی تعلقات ہیں۔ جگت سنگھ نے بتاتے ہوئے کہا۔ میں اس کو ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ ڈاکے مارنے کا وقت نہیں۔ اور اب یہ اپنے گروہ کو میرے گاؤں لے آیا۔ میں اس کے ساتھ یہ تمام معاملات نمٹا لوں گا۔ ڈاکو دریا کی طرف چلے گئے۔

سمندری کوؤں کا ایک جوڑا چونکا دینے والی آواز میں رات کی خاموشی کو توڑ رہا تھا۔

''کیا تم پولیس کو ان کی رپورٹ کرو گے۔'' نورو نے پوچھا جگت سنگھ نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔'' چلو ہم واپس چلیں۔ اس سے پہلے کہ ان کو گاؤں میں میری غیر

موجودگی کا علم ہو۔"

دونوں منوں مجرا کی طرف واپس چل پڑے۔ جگت سنگھ آگے تھا۔ نورو اس سے تھوڑا پیچھے چل رہی تھی۔ وہ دردناک چیخوں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن سکتے تھیں عورتیں چھت پر چیخ رہی تھیں۔

سارا گاؤں جاگا ہوا تھا۔ جگت سنگھ جوہڑ کے کنارے رک گیا اور نورو سے بات کرنے کیلئے واپس مڑا۔

"نورو۔ کیا تو کل آئے گی۔" اس نے پوچھا۔ "تم کل کا سوچ رہے ہو اور مجھے اپنی زندگی کی فکر ہے۔ اگر میں مر بھی گئی تو تم اپنا وقت اچھا گزار لو گے۔"

"جب تک میں زندہ ہوں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ منو مجرا میں کوئی ایسا نہیں جو تیری طرف نظر اٹھا سکے اور جگا سے بچ جائے۔ میں کسی کیلئے بدمعاش نہیں ہوں۔" اس نے غرور سے کہا۔ تم مجھے کل بتانا کہ کیا ہوا یا پھر کل دن گزرنے کے بعد جب یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ ختم ہو جائے۔ سمجھ گئیں مال گاڑی کے آنے کے بعد۔"

نہیں، نہیں، نہیں۔ نورو نے جواب دیا۔

"میں اب اپنے باپ سے کیا کہوں گی۔ اس شور نے اسے جگا دیا ہوگا۔"

"بس کہہ دینا کہ میں باہر گئی تھی۔ میرا معدہ خراب تھا یا پھر ایسا کوئی بہانہ کر دینا تو کہہ دینا کہ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور میں چھپ گئی تھی جب تک ڈاکو چلے نہیں گئے، کیا اب تو کل آئے گی؟

"نہیں" نورو نے دوبارہ کہا۔

لیکن اس دفعہ اس کے انکار کی شدت میں کمی تھی۔

باپ کے آگے اسکا بہانہ کام کر گیا کیونکہ اس کا باپ نابینا تھا۔ وہ اس کی سلک کی قمیض اور اس کی آنکھوں سے اڑا ہوا سرمہ نہ دیکھ سکا۔

نوراں یہ قسمیں کھاتی ہوئی اندھیرے میں آگے بڑھ گئی کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔

جگت سنگھ اپنے گھر کی گلی کی طرف چل پڑا۔ دروازہ کھلا تھا۔ بہت سے گاؤں

والے صحن میں اس کی ماں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے واپس مڑا اور واپس دریا کی طرف چل پڑا۔

O

نوکر شاہی دور میں منوں مجرا کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی جس کی وجہ ریلوے پل کے شمال میں ایک آفیسر کا ریسٹ ہاؤس تھا۔

یہ چپٹی چھتوں والا خاکی اینٹوں سے تیار کیا گیا بنگلہ ہے جس کا برآمدہ سامنے دریا کی طرف ہے۔ یہ چھوٹی دیواروں کے ساتھ مربع پلاٹ کے درمیان میں بنایا گیا ہے۔ گیٹ سے لیکر برآمدہ تک ایک راہداری بنائی گئی اور اس کو دونوں طرف سے اینٹوں سے مزین کیا گیا۔ اس طرح وہ باغ سے الگ نظر آ رہی ہے۔ باغ کو گیلی مٹی سے تیار کیا گیا ہے۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ ساتھ کچھ یاسمین پھول کے پودے اگ آئے ہیں اور یہ ایک قطار میں نوکروں کے کوارٹر سے لیکر گھر کے پچھلے حصے تک پہنچ گئے تھے۔

یہ ریسٹ ہاؤس درحقیقت پل کی تعمیر کرنے والے انجینئرز کیلئے بنایا گیا تھا۔ پل کی تعمیر کے بعد یہ سینئر آفیسرز کی ملکیت میں آ گیا۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دریا کے کنارے واقع ہے۔

سردیوں میں جب دریا پیچھے کی طرف مڑ جاتا تو اس کی چھوڑی ہوئی مٹی میں کاغذ کے پودے اگ آتے اور جوہڑ پیچھے رہ جاتے ان جگہوں پر کثیر تعداد میں ہنس چھوٹی بطخیں اور اس قسم کے بہت سے دریائی پرندے آ جاتے۔ اور یہ قدرتی تالاب رہو اور ملی مچھلی سے بھر جاتا ہے۔ تقریباً تمام سردیاں آفیسرز منوں مجرا کے اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کیلئے دورے کرتے رہتے۔

وہ آبی جانوروں کو صبح سورج طلوع ہونے کے بعد اور دن میں تیتر پکڑتے اس کا گوشت کھاتے۔ دوپہر کے بعد مچھلیاں اور ایک بار پھر شام کو واپسی پر بطخوں کا شکار کرتے۔

بہار کے موسم میں یہاں محبت کرنے والے شراب کے نشے میں دھت ہو کر محبت کرتے۔

بہار کے موسم میں یہاں رومانی لوگ اپنی شراب کی چسکیوں میں ڈوب کر رومان کرتے اور دریا کے اس پار غروب ہوتے سورج کی سرخی کو دیکھتے۔ دلدل سے اٹھنے والی مینڈکوں کے خراٹے کی آوازیں سنتے۔ اور گزرتی ہوئی ٹرین کی چھک چھک کی آواز سنتے۔

نرسل (آبی پودا) کے درمیان تیزی سے اڑتے ہوئے جگنوؤں کا مشاہدہ کرتے جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا جیسے پل کے نیچے سے چاند آ رہا ہو۔ گرمیوں کے ابتدائی ماہ میں منوں مجرا کے ریسٹ ہاؤس میں صرف وہ لوگ آتے جو تنہائی پسند ہوتے۔ لیکن جیسے ہی مون سون کی گرمی ختم ہوتی آنے والوں کی تعداد ڈبل ہو جاتی۔ جو کہ ستلج کے پانی کے اتار چڑھاؤ کے ڈرا دینے والے مناظر کو دیکھنے کیلئے آتے۔

ڈکیتی سے پہلے منوں مجرا کا یہ ریسٹ ہاؤس ایک اہم مہمان کے استقبال کی تیاری کر رہا تھا۔ خاکروب باتھ روم دھو رہے تھے۔ کمرے میں جھاڑو دے رہے تھے۔ سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ خدمتگار اور اس کی بیوی فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کر کے انہیں دوبارہ ترتیب دے رہے تھے۔ ایک خاکروب لڑکا مضبوط رسی پنکھے پر ڈال کر اسے چھت پر ٹانگ رہا تھا۔ اس نے رسی کو دیوار کے سوراخ میں سے گزار دیا تاکہ وہ اسے برآمدہ سے کھینچ سکے۔ اس نے ایک نیالال کپڑا لے کر اس پنکھے پر ڈالا۔ اور برآمدے میں بیٹھ کر اسے رسی سے کھینچنے لگا۔ اور پنکھے کی رسی کی ڈھیلی گرہ کو بھی کس دیا۔

باورچی خانے سے مرغے کا سالن پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ گیارہ بجے پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبل سائیکل پر تمام انتظامات کا معائنہ کرنے کیلئے آئے۔ تب ہی دو خدمتگار بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے سفید یونیفارم پہن رکھی تھی اور کمر پر سرخ رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سفید پگڑی جس کے اوپر سامنے چوڑی پٹی لگی ہوئی تھی پہنی ہوئی تھی۔ پٹی کے اوپر پنجاب گورنمنٹ کا پیتل کا علامتی نشان لگا ہوا تھا اور اس پیتل کی پتری کے اوپر سورج پانچ لہروں کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ جو صوبے کے پانچ دریاؤں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ بہت سے گاؤں والے تھے جنہوں نے سامان سفر اٹھایا ہوا تھا اور چمکدار کالی سرکاری فائلیں بھی۔

ایک گھنٹے بعد ایک بڑی سے سرمئی امریکن کار ریسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہوئی۔ ایک خدمتگار آگے کی سیٹ سے باہر نکلا اور اپنے مالک کیلئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

سب انسپکٹر اور سپاہی سلوٹ مارنے کیلئے آگے بڑھے۔

گاؤں والے اس کی تعظیم کی خاطر دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے ایک خدمتگار نے لوہے کی جالی کا دروازہ کھولا۔ جس میں سے مسٹر حکم چند ضلع کا مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر باہر نکلا۔ سارے دن کے سفر کی وجہ سے وہ کچھ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

اس کے ہونٹوں سے لگی ہوئی سگریٹ کا دھواں اس کی آنکھوں کو گرما رہا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبی اور ماچس پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کی کمر کو دوستانہ انداز میں تھپتھپایا جبکہ باقی دوسرے لوگ اسی طرح چستی سے کھڑے رہے۔

"آیئے انسپکٹر صاحب' اندر آ جائیں۔" حکم چند نے کہا۔ اور وہ انسپکٹر کا دایاں ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اندر کمرے میں لے گیا ایک خدمتگار اور ڈپٹی کمشنر کا ذاتی نوکران کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

کانسٹیبل نے کار سے سامان سفر اتارنے میں ڈرائیور کی مدد کی۔ حکم چند نے سب سے پہلے باتھ روم میں جا کر اپنا منہ دھویا۔ وہ تولیے سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے باہر آ گیا۔ سب انسپکٹر دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔ حکم چند نے سب انسپکٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے تولیہ اپنے بستر پر پھینک دیا اور خود ایک آرام دہ کرسی میں بیٹھ گیا۔

پنکھے نے آہستہ آہستہ آگے اور پیچھے چلنا شروع کر دیا جس سے دیوار کے سوراخ میں سے گزرتی رسی نے آواز پیدا کرنا شروع کی۔

ایک ماتحت نے مجسٹریٹ کے جوتے اور جرابیں اتاریں اور اس کے پاؤں صاف کرنے کیلئے رگڑنے لگا۔

حکم چند نے سگریٹ کی ڈبی کھولی اور اسے انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ سب انسپکٹر

نے پہلے مجسٹریٹ کی سگریٹ جلائی اور پھر اپنی، حکم چند کے سگریٹ پینے کا انداز نچلے درمیانی طبقے کو دغا دینے والوں جیسا تھا۔

اس نے ناک سکیڑی اور اپنا منہ زور سے بھینچا ہوا تھا۔سب انسپکٹر نے اپنی انگلیوں کو ایش ٹرے کے طور پر پیش کیا۔ سب انسپکٹر ایک جوان آدمی تھا اور اس وقت وہ اور بھی زیادہ بناوٹی آداب دکھا رہا تھا۔

''اچھا! انسپکٹر صاحب حالات کیسے ہیں؟'' حکم چند نے پوچھا۔ سب انسپکٹر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا معاف کرنے والا ہے۔ہمیں تو صرف آپکی مہربانی کی ضرورت ہے۔اس علاقے میں کسی قسم کے فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہو رہے۔ جناب! ہم نے اس علاقے کو ان چیزوں سے بہت دور رکھا ہوا ہے۔ کچھ سکھ اور ہندو مہاجر پاکستان سے آئے ہیں اور کچھ مسلمان بھی یہاں سے گئے ہیں۔لیکن ہمیں ایسا کوئی واقعہ دیکھنے کو نہیں ملا۔''

'' تم نے سرحد کے اس پار سے مرے ہوئے سکھوں کی منتقلی نہیں کی۔ جو کہ امرتسر کی طرف آتے رہے ہیں۔ ہر طرف قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔'' حکم چند نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور زور سے اپنی رانوں کے اوپر رکھتے ہوئے اشارہ کیا اس کی سگریٹ کی چنگاری اڑ کر اس کے پاجامے پر گر گئی سب انسپکٹر نے جلدی سے ہاتھ مار کر انہیں بجھا دیا۔

''کیا تم جانتے ہو؟ مجسٹریٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سکھ پاکستان جانے والے مسلمانوں کی ٹرین پر حملہ کر کے اسے سرحد کے اس پار سینکڑوں لاشوں کے ساتھ بھیج رہے ہیں وہ انجن پر لکھ دیتے ہیں۔ پاکستان کیلئے تحفہ۔''

سب انسپکٹر نے نیچے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر جواب دیا'' وہ کہتے ہیں کہ اس پار قتل و غارت روکنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ لیکن ہم ہندو یہ سب کچھ پسند نہیں کرتے۔ درحقیقت ہم چھری 'چاقو' کا یہ کھیل نہیں کھیل سکتے ہاں۔ البتہ جب یہ لڑائی آزادانہ لڑی جائے گی تو ہم کسی سے بھی لڑ سکتے ہیں۔ مجھے اپنے آر ایس ایس کے جوانوں پر بھروسہ ہے کہ وہ تمام شہروں میں ایسے گروہ کو ختم کر دیں گے۔ جو فسادات میں ملوث

ہیں۔ یہاں ہم سرحد کے قریب سکھوں کے گاؤں میں مسلمانوں کے ساتھ رہ رہے ہیں لیکن یہاں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ ہر صبح اور شام کو مؤذن اذان دے کر گاؤں کے لوگوں کو نماز کیلئے بلاتا ہے جیسے کہ منوں مجرا میں۔ اگر آپ سکھوں کو کہیں گے کہ وہ انہیں اس کی اجازت کیوں دیتے ہیں تو وہ جواب دیں گے کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے پیسے لیتے ہیں۔''

حکم چند نے اپنی پیشانی پر سے بال پیچھے ہٹانے کیلئے انگلیاں پھیریں۔

''کیا اس علاقے میں کوئی کھاتا پیتا امیر مسلمان ہے؟''

''کچھ زیادہ نہیں جناب۔ ان میں سے بہت سے جولاہے اور مزدور ہیں۔''لیکن چندن نگر ایک اچھا پولیس اسٹیشن کہلاتا ہے۔ وہاں پر قتل اور ناجائز کام ہو رہے ہیں۔ اور سکھ کسان کامیاب ہیں۔

تمہاری مدد سے انہوں نے شہر میں اپنے ذاتی گھر بنا لیے ہیں۔''

''آپ کا یہ اعزاز مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

'' تم جو کچھ کرتے ہوئے میں نے اس کا برا نہیں منایا۔ مقصد کے اندر رہتے ہوئے طریقے سے ہر کوئی یہ کر سکتا ہے لیکن احتیاط سے نئی ہندوستانی حکومت یہ سب کچھ ختم کرنے کیلئے بڑی بڑی باتیں کر رہی ہے لیکن کچھ مہینوں بعد دفاتر میں یہ جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ویسے ہی ہوتا رہے گا۔ایک ہی رات میں سب کچھ بدلنے کا یہ طریقے کار ٹھیک نہیں ان کے پاس باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دہلی سے آنے والے کسی شخص سے بھی اگر تم پوچھوں تو وہ تم سے یہی کہے گا کہ گاندھی کے سب شاگرد پیسہ بنا رہے ہیں انہوں نے پارسائی سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں جس طرح ایک یوگی اپنا کفارہ ادا کرتا ہے۔ کہ جیسے ہی مچھلی قریب آئے اسے ہڑپ کر جاؤں۔''

حکم چند نے ایک نوکر کو حکم دیا کہ اس کے پاؤں صاف کر کے بیئر نکالے۔

جیسے ہی وہ دونوں اکیلے ہوئے۔ اس نے اپنا ہاتھ دوستانہ انداز میں سب انسپکٹر کے گھٹنے پر رکھا۔ اور کہا۔'' تم بچوں کی طرح جلد بازی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ چیز تمہیں

ایک دن مشکل میں ڈال دے گی۔تمہارا اصول یہ ہونا چاہیے کہ دیکھو سب کچھ لیکن کہو کچھ نہیں دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے اور اگر تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کے پیچھے لگ کر یا کسی کی رائے سے نہیں حاصل کر سکتے۔ اگر تم کسی چیز کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہو تو چپ رہنا سیکھو‘‘۔سب انسپکٹر کا دل شکر گزاری کے جذبے سے گرما گیا۔

وہ اس غیر ذمے دار تنقید نگار کی نصیحتوں کو اپنے بزرگوں کی طرح سننا چاہتا تھا۔

وہ جان گیا کہ حکم چند اس سے خوش ہے۔’’کئی دفعہ سر! میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا گاندھی کیپ کیا کر رہی ہے؟ کیا دہلی میں لوگ پنجاب کے بارے میں جانتے ہیں۔‘‘

’’پاکستان کے اس طرف کیا ہو رہا ہے۔ ان کیلئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔وہ اپنے گھر اور اپنی وراثت کو کھونا نہیں چاہتے وہ سڑکوں پر اپنی ماؤں بیویوں اور بہنوں کی عصمت دری اور قتل کا تماشا نہیں دیکھنا چاہتے۔

کیا یہ سننا تمہارے لیے اعزاز ہوگا کہ مسلمانوں نے شیخوپورہ اور گوجرانوالہ بازار میں ہندو اور سکھ مہاجروں کے ساتھ کیا کیا؟

ضمیر زندہ نہیں رہا۔عورتوں نے اپنے بچے مار دیئے اور خود کنوؤں میں چھلانگ لگا دی جو کہ لاشوں سے لبالب بھر گئے ہیں۔حکم چند نے ہاتھ جوڑ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہاں ’’ہرے رام۔ ہرے رام۔‘‘

میں یہ سب جانتا ہوں۔ ہماری ہندو خواتین ایسی ہی ہیں وہ خودکشی کرنے کا جرم تو قبول کر لیں گی لیکن یہ برداشت نہیں کریں گی کہ کوئی غیر انہیں ہاتھ لگائے۔ ہم ہندو عورتوں کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔لیکن ان کے نزدیک کمزور جنس عورت کی کوئی عزت نہیں۔‘‘

’’لیکن ہم اس کے بارے میں کیا کر سکتے ہیں۔کتنی طویل مدت ہوگئی ہے اس سلسلے کو یہاں شروع ہوئے مجھے امید ہے کہ ہم منو مجرا سے آنے والی ٹرین کو لاشوں سے بھرا نہیں پائیں گے۔‘‘

’’یہ ممکن نہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کو انتقام سے روکا جائے۔ ہمارے اردگرد مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے سینکڑوں گاؤں ہیں اور یہاں ہر سکھ گاؤں میں کچھ مسلمان

خاندان بھی آباد ہیں۔‘‘ سب انسپکٹر نے مجسٹریٹ کے دل کی بات جاننے کیلئے کہا۔

حکم چند نے اپنی سگریٹ کا زور سے کش لیا اور اسے اپنی انگلیوں میں پکڑ لیا۔

ہمیں لا اینڈ آرڈر کا خیال رکھنا چاہیے مجسٹریٹ نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ اگر ممکن ہو تو مسلمانوں کو امن سے یہاں سے بھیج دینا چاہیے۔خون خرابے سے کسی کو بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

برے کردار والے سارا مال حاصل کر لیں گے اور حکومت ہم پر قتل کے الزامات لگائے گی۔

نہیں انسپکٹر صاحب! ہماری رائے کچھ بھی ہو اور خدا جانتا ہے۔ کہ اگر ہم حکومت کے ملازم نہ ہوتے تو ہم ان پاکستانیوں کے ساتھ کیا کرتے۔ ہم ان کو کسی کے قتل اور جائیداد کی تباہی کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ ان کو باہر نکال دو لیکن احتیاط سے۔ وہ اپنے ساتھ زیادہ کچھ نہیں رکھتے۔

پاکستان میں بسنے والے ہندو منتقلی کی اجازت ملنے سے پہلے ہی اپنی سب جائیدادیں وہیں چھوڑ آئے۔ پاکستانی مجسٹریٹ راتوں رات لکھ پتی بن گیا۔لیکن ہمارے میں سے کسی نے ایسا برا نہیں کیا۔

صرف ان علاقوں میں جہاں قتل اور آگ لگانے کے واقعات رونما ہوئے حکومت نے ان کو معطل کر دیا یا ان کا تبادلہ کر دیا۔

یہاں پر کوئی قتل نہیں ہونا چاہیے صرف پرسکون انخلاء ہو۔

خدمتگار شراب کی ایک بوتل لایا اور دو گلاس حکم چند اور سب انسپکٹر کے آگے رکھ دیئے۔سب انسپکٹر نے اپنا گلاس اٹھایا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

’’نہیں سر! میں گستاخ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آپ کی موجودگی میں پی سکتا ہوں۔‘‘ مجسٹریٹ نے اس احتجاج کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔’’ تم میرا ساتھ دو گے۔ یہ ایک حکم ہے۔

خدمتگار! انسپکٹر صاحب کا گلاس بھر دو اور ان کیلئے کھانا لے آؤ۔‘‘ سب انسپکٹر نے اپنا گلاس بھروانے کیلئے خدمتگار کو دے دیا اگر آپ کا حکم ہے تو میں انکار نہیں کر سکتا۔

وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر میز پر رکھ دی۔

یہ کوئی سکھوں کی پگڑی نہیں تھی جسے ہر وقت پہننے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ تو صرف تین گز کی کلف لگی ہوئی خاکی ململ کی پگڑی تھی جس کے درمیان میں نیلے رنگ کی تنگ سی ٹوپی لپٹی ہوئی تھی۔ جسے کسی بھی وقت ایک ٹوپی کی مانند پہنا اور اتارا جا سکتا ہے۔ ''منوں مجرا کی کیا صورت حال ہے؟''

سب کچھ ٹھیک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منوں مجرا میں کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں کہ انگریز جا چکے ہیں اور ملک دو حصوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم ہو گیا ہے۔

تمہیں ایک آنکھ منوں مجرا پر رکھنی چاہیے۔ یہ سرحد کا بہت اہم گاؤں ہے۔ یہ پل کے بہت نزدیک ہے۔ کیا اس گاؤں میں کوئی بدمعاش آدمی ہے۔''

''صرف ایک جناب! اس کا نام جگا ہے۔ ہم نے اسے گاؤں میں قید کر دیا ہے۔ وہ روز اپنی رپورٹ دیتا ہے۔ اور ہر ہفتے پولیس اسٹیشن آتا ہے۔'' سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

''جگا۔ وہ کون ہے؟''

''آپ کو جگت سنگھ یاد ہو گا جو کہ ڈاکو الام سنگھ کا بیٹا تھا اور جسے دو سال پہلے پھانسی ہوئی تھی۔ یہ اس کا ایک بڑا ساتھی ہے۔ اور اس علاقے کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ وہ تقریباً چھ فٹ اور چار انچ لمبا اور چوڑا ہو گا۔ وہ ایک موٹے بیل کی مانند ہے۔'' سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

''اوہ، ہاں، مجھے یاد ہے۔ وہ اپنے آپ کو شر انگیزی سے دور رکھنے کیلئے کیا کرتا ہے۔''

''وہ ہر مہینے کسی نہ کسے مقدمے کے سلسلے میں میرے روبرو آنے کا عادی ہو گیا ہے۔'' سب انسپکٹر نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ جناب! جو کام پنجاب کی پولیس کرنے میں ناکام ہو گئی وہ سولہ سالہ لڑکی کی جادوئی آنکھوں نے کر دیا۔

حکم چند کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ کیا اس نے رابطہ رکھا ہوا ہے؟ حکم چند نے پوچھا۔

''ہاں مسلمان جولاہے کی بیٹی کے ساتھ۔ وہ کالی ہے لیکن اس کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ وہ یقیناً جگا کو گاؤں میں روکے رکھتی ہے۔ اور کسی کی جرات نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ اس کا اندھا باپ مسجد کا مؤذن ہے۔'' دونوں شراب اور سگریٹ پیتے رہے جب تک کہ خدمتگار کھانا لے آیا۔

وہ دوپہر کے بعد کافی دیر تک کھاتے پیتے رہے اور ضلع کی صورت حال پر بحث کرتے رہے۔

شراب اور عمدہ کھانے کی وجہ سے حکم چند پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ دوپہر کو سورج کی چندھیا دینے والی روشنی سے بچنے کیلئے برآمدے میں چکیں ڈال دی گئیں۔ پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور چوں چوں کی آواز کے ساتھ آگے پیچھے ہو رہا تھا۔

حکم چند پر اونگھنے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی سلور کی ٹوتھ پک نکالی۔ دانت صاف کیئے اور ٹوتھ پک کو میز کے کپڑے پر پھینک دیا۔

سب انسپکٹر نے مجسٹریٹ کو اونگھتے دیکھا تو جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جناب! کیا میں جا سکتا ہوں۔''

اگر تم آرام کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یہاں ایک بستر مل سکتا ہے۔'' آپ بہت مہربان ہیں۔ سر' لیکن مجھے پولیس اسٹیشن میں کچھ کام دیکھنے ہیں۔ میں یہاں دو کانسٹیبل چھوڑ جاؤں گا۔ اگر آپ کو میری ضرورت محسوس ہوئی تو یہ مجھے اطلاع دے دیں گے۔''

''اچھا!'' مجسٹریٹ نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ ''کیا تم نے شام کیلئے کچھ انتظامات کیئے ہیں؟'' حکم چند نے سوالیہ انداز سے کہا

کیا میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اسے بھول جاؤں۔ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ اگر وہ آپ کو خوش نہیں کرے گی تو آپ مجھے نوکری سے معطل کر دیجئے گا۔''

میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا کہ جہاں آپ جانا چاہیں وہ لے جائے اور پارٹی کا انتظام کرے۔ سب انسپکٹر سلیوٹ کر کے چلا گیا۔

مجسٹریٹ دوپہر گئے تک قیلولہ کرنے کیلئے بستر پر لیٹ گیا۔ بنگلے میں داخل ہونے والی کار کی آواز سے حکم چند کی آنکھ کھل گئی۔ ڈنڈیوں سے بنی ہوئی چک جو کہ

برآمدہ میں لٹکائی گئی تھی بڑے دائرے میں لپیٹ کر ستونوں کے درمیان باندھ دی گئی۔

سفید بنگلے جیسا برآمدہ ڈوبتے سورج کے عنبری رنگ میں بہت دلکش لگ رہا تھا۔ خاکروب اپنے ہاتھ میں پنکھے کی رسی پکڑ کر اینٹوں کے فرش پر لیٹا ہوا تھا جبکہ اس کا باپ ریسٹ ہاؤس میں پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

زمین سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو لوہے کی جالی کے دروازے کے پاس یاسمین پھولوں کی خوشبو سے مل گئی تھی۔

گھر کے سامنے نوکروں نے ایک بڑی چٹائی بچھا کر اس پر قالین بچھا دیا تھا قالین کے ایک کونے میں بید کی ایک بڑی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر ایک شراب کی بوتل دو گلاس اور کھانے کیلئے پلیٹیں رکھی گئی تھیں۔ سوڈے کی بہت سی بوتلیں میز کے دوسری طرف ایک قطار میں کھڑی تھیں حکم چند نے نوکر سے چلا کر کہا کہ اس کے نہانے کا انتظام کیا جائے اور شیو کرنے کیلئے گرم پانی لایا جائے۔

اس نے سگریٹ اٹھائی اور بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ تقریباً اس کے سر کے اوپر دو چھپکلیاں آپس میں لڑنے کیلئے تیار ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے جھنجھلا دینے والی آوازیں نکال کر ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے ایک انچ کے فاصلے پر رک گئیں اور اپنی دم کو آہستہ آہستہ ہلانا شروع کیا۔ کافی غور و خوض کے بعد وہ دونوں چھپکلیاں خطرناک طریقے سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئیں۔

اس سے پہلے کہ حکم چند وہاں سے ہٹ پاتا۔ وہ زور سے اس کے تکیے کے پاس آ گریں۔ ایک سرسراہٹ اس کے جسم پر طاری ہوئی۔ اس نے بستر پر سے چھلانگ لگائی اور چھپکلیوں کو گھورنا شروع کر دیا۔ چھپکلیاں اس کی طرف سے واپس پلٹیں۔ ایک دوسرے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے جیسے کہ ایک دوسرے کو پیار کر رہی تھیں۔ خدمتگار کے قدموں کی آواز نے مجسٹریٹ کے گھورنے کے اس سلسلے کو ختم کیا اور چھپکلیوں کو ایک دوسرے کے احترام سے بھی روکا۔ چھپکلیاں بستر کے نیچے گھس گئیں اور دیوار پر سے ہوتی ہوئی دوبارہ چھت پر پہنچ گئیں۔ حکم چند نے محسوس کیا کہ اگر وہ چھپکلیوں کو چھو لیتا تو وہ اس

کے ہاتھ گندے کر دیتیں۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی قمیض سے رگڑے۔ یہ عمل نجاست کو دور نہیں کرتا تھا جتنا کہ دھونے سے صاف ہو سکتا تھا۔

خدمتگار گرم پانی کا ایک مگ لے آیا اور ڈریسنگ ٹیبل پر شیونگ کا سارا سامان رکھ دیا اس نے کرسی پر حکم چند کے کپڑے رکھ دیئے ایک باریک سی ململ کی قمیض۔ ایک ڈھیلہ سا پاجامہ جس پر تاروں سے نرم ملائم نیلا مور بنایا گیا تھا اور اسے سلور دھاگے سے بھرا گیا تھا۔

حکم چند بڑی احتیاط سے نہایا اور شیو کروائی۔ نہانے کے بعد اس نے اپنے چہرے اور بازوؤں پر سکن لوشن ملا۔ اور اپنے جسم پر ٹیلکم پاؤڈر چھڑکا۔ اس نے اپنی انگلیاں عطر میں ڈبوئیں۔

بالوں والی کریم نے اس کے بال بہت نرم اور سلکی بنا دیئے۔ اب سفید بال صرف اپنی جڑوں سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے انہیں پندرہ دنوں سے رنگا نہیں تھا۔ اس نے اپنی موٹی مونچھوں کو بڑھایا ہوا تھا۔ وہ اپنی ان مونچھوں کو اس وقت تک مروڑتا رہا جب تک کہ اس کے آخری حصے سخت ہو کر آنکھوں کی طرف نہیں مڑ گئے۔ اس کی مونچھوں کی جڑیں بھی اودی اور سفید نظر آ رہی تھیں۔

اس نے باریک ململ کی قمیض پہنی جس میں سے اس کا کشادہ جسم صاف نظر آ رہا تھا اس کا پاجامہ کلف لگ کر تیار تھا اس نے گلاب کی مشک میں اپنے کپڑوں کو ڈبویا۔ تیار ہونے کے بعد اس نے اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ چھپکلیاں اپنی چمکدار گول کالی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

ایک امریکی کار ریسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہوئی۔ حکم چند اپنی مونچھوں کو مروڑتا ہوا لوہے کی جالی کے دروازے کی طرف گیا۔

دو آدمی اور دو خواتین کار سے باہر نکلیں۔

ان میں سے ایک آدمی نے ہارمونیم اٹھایا ہوا تھا جب کہ دوسرے نے دو ڈرم اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ جس کے سفید بال مہندی کے لال رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ جبکہ دوسری عورت ایک جوان لڑکی تھی جس کا منہ کچھ

پھولا ہوا تھا۔ اور اس نے ناک میں ہیرے کا کوکہ پہنا ہوا تھا۔ جب وہ گاڑی سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا بنڈل تھا جس میں گھنگرو تھے۔

پارٹی آ کر قالین پر بیٹھ گئی۔

حکم چند نے خود کو آئینے میں بغور دیکھا۔ اس نے بالوں کی جڑوں کی سفیدی کو دیکھا تو ان کو دوبارہ سے برابر کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے روایتی انداز میں سگریٹ اور ماچس اٹھائی۔ اور لوہے کی جالی کا دروازہ کھولتے ہوئے اپنے خدمتگار کو شراب لانے کا حکم دیا۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پہلے ہی میز پر رکھی جا چکی ہے۔ یہ باہر کے لوگوں کو اپنے آنے کی اطلاع دینے کا انداز تھا۔ جب وہ باہر آیا تو اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ آہستہ آہستہ سوچ کر قدم اٹھاتے ہوئے اپنے چمکدار چمڑے کے جوتوں کی آواز کے ساتھ وہ بید کی کرسی تک گیا۔

پارٹی مجسٹریٹ کی تعظیم میں کھڑی ہو گئی۔ دو ساز بجانے والوں نے سلام کر کے اپنے سر جھکائے۔ بوڑھی عورت جس کے دانت بھی ٹوٹ چکے تھے بلند آواز میں تعریفی کلمات گانے لگی۔ ''اللہ آپ کی شہرت اور عزت میں اضافہ کرے۔ آپ کا قلم سینکڑوں ہزاروں لوگوں کا نصیب لکھے۔''

جوان لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی جس کو اس نے سرمے اور کاجل سے سجایا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا۔

بوڑھی عورت کے نیچے سے ریں ریں کرنے کی آواز آئی۔ وہ چاروں قالین پر بیٹھ گئے۔ خدمتگار نے اپنے مالک کیلئے شراب اور سوڈا انڈیلا۔ حکم چند نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور ہاتھ سے مونچھیں پونچھنے لگا۔

وہ گھبراہٹ کے عالم میں تیزی سے اس کی طرف گھوما لڑکی نے اپنا بنڈل کھولا اور گھنگرو اپنے ٹخنے کے اردگرد باندھ لئے ہارمونیم بجانے والے نے اکیلے ہارمونیم بجا کر یادداشت پیش کی اس کی ساتھی نے چھوٹی سی ہتھوڑی سے ڈرم کے چاروں طرف تیزی سے چوٹ لگائی۔ اور ہتھوڑی کی مدد سے ڈرم کے چمڑے کے تسموں کو کسا اور ڈھیلا کیا۔

ان کے درمیان کے لکڑی کے گول بلاک کو الگ الگ کیا۔ اس نے اپنی انگلیوں سے سفید کھال کو مار کر اس کے کساؤ کو دیکھا آخر ڈرم بھی ہارمونیم کے ساتھ بجنے کیلئے تیار ہو گئے۔

تمام سازندے تیار تھے۔ جوان لڑکی نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔ بوڑھی عورت نے کہا۔ آپ کی پسند کیا ہے؟ کچھ کلاسیکل گاؤں' یا پھر کوئی محبت کا گیت'۔

نہیں۔ مجسٹریٹ نے کہا۔

کچھ فلم میں سے گاؤ۔ کوئی اچھا سا فلمی گانا۔ کوئی مقبول پنجابی گانا۔ جوان لڑکی نے مجسٹریٹ کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ جیسے آپ کا حکم۔

سازندوں نے صلاح مشورے کے بعد ساز بجانا شروع کیا۔

ڈرم نے گانے کی ابتدائی لے بجائی اور پھر آہستہ آہستہ کم ہو کر ہارمونیم کے ساتھ مل کر بجنے لگا۔

ان دونے تو کچھ دیر کیلئے میوزک بجایا۔ جبکہ لڑکی خاموش بیٹھی تھی وہ بے پرواہ اور بور نظر آ رہی تھی۔

جب انہوں نے اپنا تمہیدی حصہ ختم کیا تو لڑکی نے اپنی ناک اور گلا دوبارہ صاف کیا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ کان پر رکھا اور اپنی باریک تیز آواز میں مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے سب کا دھیان اس کی طرف کروایا۔

گانے کے بعد لڑکی نے کچھ وقفہ کیا۔ سازندوں نے دوبارہ سے اس کیلئے ساز بجانا شروع کیا تا کہ وہ گانے سے کچھ دیر کیلئے رک سکے۔

اے خط میرے محبوب کو سکھاؤ
جدائی کی آگ کیسے جلتی ہے۔

جب لڑکی نے اپنا گانا ختم کیا۔ حکم چند نے پانچ روپے کا ایک نوٹ قالین پر پھینک دیا۔

لڑکی اور سازندوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔

بدصورت بڑھیا نے پیسے اکٹھے کیے اور اپنے بٹوے میں ڈالتے ہوئے چلا چلا کر

کہنے لگی۔

خدا آپ کی حکومت سدا قائم رکھے آپ کا قلم سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے نصیب لکھے۔ گانا دوبارہ شروع ہو گیا۔

حکم چند نے اپنے آپ کو شراب میں غرق کر لیا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی مونچھیں پونچھیں۔ اور لڑکی کو دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

وہ ایک گانا گا رہی تھی جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو گنگناتے سنا تھا۔ ”ہوا میں اوڑتا جائے میرا لال ڈوپٹہ ململ کا۔ ہو جی۔ ہو جی۔“

حکم چند تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک اور شراب اٹھائی اور اپنے ضمیر کی آواز کو رد کر دیا۔

باضمیر لوگوں کی زندگی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔

اس نے وقت گزارنے کیلئے اپنی انگلیاں گانے کی دھن کے ساتھ ہلانا شروع کیں اور اپنی رانیں ایک دوسرے پر مارنے لگا۔

طلوع آفتاب کی روشنی نے رات کے اندھیرے کو آنے کی اجازت دے دی دریا کے ساتھ دلدل میں سے مینڈکوں کی ٹرٹر کی آوازیں آنے لگیں جھینگروں نے اپنی بانسری بجانا شروع کر دی۔

خدمتگار مٹی کے تیل کا ایک لیمپ لے کر آیا جس میں سے نیلے رنگ کی چمکدار روشنی نکل رہی تھی۔ لیمپ کے فریم کا سایہ حکم چند پر پڑ رہا تھا۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو کہ لیمپ کی روشنی کی آڑ میں بیٹھی تھی۔ وہ ایک بچی تھی اور زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ صرف تھوڑی جوان اور بے داغ تھی۔ اس کی معمولی چھاتی نے اس کی چولی کو ابھارا ہوا تھا۔ وہ مردانہ ہاتھ کے لمس کو نہیں جانتے تھے۔

اس سوچ نے کہ شاید اس کی اپنی بیٹی اس لڑکی سے کہیں زیادہ جوان ہے اس کے ذہن کو بھڑکا دیا۔ اس نے اس خیال کو ایک اور شراب پی کر جھٹک دیا۔ زندگی ایسی ہے جیسے آپ اسے گزارتے ہیں۔

وہ اس سے پیسہ لینا چاہتی ہے اور وہ دے گا جب سب معاملات کہہ سن کر

طے ہوئے تو اس نے سب دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک طوائف تھی۔

چاندی کے سکے اس کی کالی ساڑھی پر چمک رہے تھے۔ اس کی ناک پر ہیرے کا کوکا ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ حکم چند نے ایک اور شراب کا گلاس پیا تاکہ اپنے شکوک کو دور کر سکے۔

اس دفعہ اس نے اپنی مونچھیں ریشمی رومال سے صاف کیں۔ اس نے زور زور سے گنگنانا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے لہرانے لگیں ایک کے بعد ایک فلمی گانا چلتا رہا جب تک کہ سارے انڈین گانے ناچ کی طرز میں نہیں بدل گئے۔ اور حکم چند جان گیا کہ پیمانہ لبریز ہو گیا ہے کچھ اور گاؤ جو تمہیں آتا ہے۔ مجسٹریٹ نے جھک کر زور سے حکم دیتے ہوئے کہا۔ کچھ نیا اور بھڑکتا ہوا۔

لڑکی نے ایک گانا گانا شروع کیا جس میں بہت سے انگریزی الفاظ تھے۔ حکم چند نے زور سے تعریفی کلمات کہے۔ واہ واہ۔

لڑکی نے جب گانا ختم کیا تو اس نے لڑکی کی طرف پانچ روپے نہیں پھینکے بلکہ اس سے کہا۔ آؤ اور میرے ہاتھ سے لے جاؤ۔

بوڑھی عورت نے لڑکی کو آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ جا سرکار تجھے دے رہے ہیں۔

لڑکی اٹھی اور میز کے پاس گئی۔ اس نے پیسے اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو حکم چند نے اٹھا کر نوٹ کو اپنے دل پر رکھ لیا۔ لڑکی نے مدد کیلئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ حکم چند نے نوٹ میز پر رکھ دیا۔

اس سے پہلے کہ لڑکی اس تک پہنچتی۔ اس نے دوبارہ اسے اوپر اٹھایا اور اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر آئی کھسیانی ہنسی اور بڑھ گئی۔ لڑکی اپنے ساتھیوں کے پاس جانے کیلئے دوبارہ واپس مڑ گئی۔

حکم چند نے تیسری دفعہ دینے کیلئے نوٹ کو دوبارہ رکھ لیا۔ سرکار کے پاس جا۔ بوڑھی عورت نے دوبارہ کہا۔ لڑکی مئودب انداز میں مڑی اور مجسٹریٹ کے پاس گئی۔ حکم چند نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا۔

تم اچھا گاتی ہو۔

لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سرکار تجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ تو انہیں کوئی جواب کیوں نہیں دیتی۔ بوڑھی عورت نے لڑکی کو ڈانٹتے ہوئے کہامعاف کرنا سرکار! لڑکی جوان اور شرمیلی ہے۔ وہ سیکھ جائے گی۔ بڑھیا نے وضاحت کی۔

حکم چند نے شراب کا ایک گلاس لڑکی کے ہونٹوں سے لگایا۔تھوڑی سی پی لو۔ صرف ایک گھونٹ میری خاطر۔ مجسٹرٹ نے دوبارہ کہا۔لڑکی بے حسی کے عالم میں اپنا منہ کھولے بغیر کھڑی ہوگئی۔

بوڑھی عورت دوبارہ بولی۔ سرکار! یہ شراب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مشکل سے سولہ برس کی ہے اور بالکل معصوم ہے۔ اس سے پہلے کبھی کسی آدمی کے پاس نہیں گئی۔ میں آپ کی شان اور عزت کے بارے میں اس کو بتا چکی ہوں۔

اگر کچھ پیتی نہیں تو کچھ کھا ہی لے ۔حکم چند نے کہا۔اس نے بوڑھی عورت کی باتوں کونظر انداز کرتے ہوئے پلیٹ سے ایک کوفتہ اٹھایا اورلڑکی کو کھلانے کی کوشش کی۔

لڑکی نے وہ اس سے لے لیا اور کھا گئی۔حکم چند نے اسے اپنی آغوش میں بٹھا لیا اوراس کے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا اس کے بالوں میں تیل تھا۔ اور اس کی زلفیں ایک پلاسٹک کے چمکدار ہیر پن میں بندھی ہوئی تھیں۔

اس نے پنوں کا جوڑا اتار لیا۔ اور پیچھے لگا بینڈ ڈھیلا کر دیا۔ بال اس کے کندھوں پر گر گئے سازندے اور بوڑھی عورت کھڑے ہو گئے'' کیا ہمیں جانے کی اجازت ہے۔''

''ہاں۔جاؤ۔ ڈرائیور تمہیں گھر پہنچا دے گا۔'' بوڑھی عورت نے دوبارہ سے اونچی آواز میں گانا' گانا شروع کر دیا۔ خدا تمہاری عزت اور شہرت میں اضافہ کرے۔ تمہارا قلم سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے نصیب جگائے۔

حکم چند نے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس کیلئے میز پر رکھ دی۔ اس کے بعد گانے والوں کا گروپ لڑکی کو مجسٹریٹ کی آغوش میں بیٹھا چھوڑ کر چلا گیا۔''

خدمتگار حکم کے انتظار میں کھڑے تھے۔''جناب! کیا کھانا پیش کروں۔''

نہیں۔ کھانا صرف میز پر چھوڑ دو۔ہم خود کھالیں گے۔تم جا سکتے ہو۔

خدمتگار نے کھانا لگایا اور خود اپنے کواٹر میں چلا گیا۔حکم چند نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مٹی کے تیل کا لیمپ باہر رکھ دیا۔ اس لیمپ کے جانے کے ساتھ ہی اس کا شور بھی باہر چلا گیا دونوں کو مکمل اندھیرے میں چھوڑ کر جہاں وہ بیڈ روم سے آنے والی مدھم سی پیلی روشنی کی جھلملاہٹ سے محفوظ تھے۔حکم چند نے باہر ہی بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

مال گاڑی منوں مجرا کی ویگنوں کو چھوڑتے ہوئے پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ اس کی رفتار ان انگاروں پر منحصر تھی جو کہ انجن کے قیف میں جل رہے تھے۔ وہ آگ جلنے والے ڈبے میں کوئلہ ڈال رہے تھے۔ ایک چمکدار لال اور پیلی روشنی پل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی اور اپنے پیچھے دوسری طرف جنگل چھوڑ رہی تھی۔ اس کے گزرنے سے تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔حکم چند نے ایک اور شراب کا گلاس پینے کیلئے خود کو تیار کیا۔لڑکی اس کی آغوش میں بیٹھی ہوئی سخت سرد ہو رہی تھی۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ تم مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔ حکم چند نے لڑکی کو اپنے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

مجسٹریٹ نے لڑکی کے اس ردعمل پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ ان سب کیلئے پیسے دے چکا تھا۔

وہ لڑکی کے چہرے کو اپنے اور قریب لے آیا اور اس کی گردن کے پیچھے اور کانوں پر بوسے دینے شروع کیے۔ وہ مال گاڑی کو اور مزید سن نہیں سکتا تھا۔ یہ ملک کے اس حصے کو مکمل تنہائی میں چھوڑ چکی تھی۔ حکم چند اپنی تیز تیز چلتی سانسوں کو سن سکتا تھا۔ اس نے لڑکی کی چولی کے تسمے کھول دیئے۔ گولیوں کے چلنے کی آواز نے رات کے سکون کو درہم برہم کر دیا لڑکی کھڑی ہوگئی۔ کیا تم نے گولی چلنے کی آواز سنی؟ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاید کوئی شکاری ہو۔ اس نے جواب دیا۔ وہ اس سے پہلی دفعہ مخاطب ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کوئی شکار نہیں ہوسکتا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ مجسٹریٹ تھوڑا پریشان ہوگیا۔

لڑکی نے کچھ دیر کیلئے اپنے محبوب کی توجہ سے چھٹکارا پایا جس کی سانسوں میں سے شراب۔ تمباکو اور پائیوریا کی بدبو آ رہی تھی۔ لیکن خاموشی نے حکم چند کو بتایا کہ سب ٹھیک تھا۔ اس نے اس یقین کو دوگنا کرنے کیلئے مزید شراب پی لی لڑکی کو یقین ہو گیا کہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

کوئی پٹاخہ ہو گا۔ کچھ لوگ شادی کرتے ہیں یا کچھ اور۔ حکم چند نے لڑکی کے گرد بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے لڑکی کی ناک کو بوسہ دیا۔ چلو ہم بھی شادی کر لیں۔ اس نے ہوس بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ اپنے آپ کو تیار کر کے میز کے درمیان لیٹ گئی جہاں باسی کوفتوں کی پلیٹیں اور ایش ٹرے رکھا ہوا تھا۔ حکم چند نے اپنے ہاتھ سے وہ سب چیزیں میز پر سے صاف کر دیں اور اپنی چاہت کو بڑھانے کیلئے آگے بڑھ گیا۔ لڑکی نے بغیر کسی احتیاط کے اس کے پنجے کو برداشت کیا۔ اس نے میز پر سے اسے اٹھایا اور قالین کے اوپر ادھر ادھر بکھرے ہوئے گلاس' پلیٹوں اور بوتلوں کے درمیان لیٹا دیا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنی ساڑھی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔ اور اس کی سانسوں سے بچنے کیلئے ادھر ادھر رخ موڑنے لگی۔

حکم چند نے اس کے کپڑوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ منوں مجرا کی طرف سے لوگوں کے چیخنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

حکم چند نے اوپر دیکھا۔ دو گولیاں چلیں اور بھونکنا اور چیخنا بند ہو گیا۔ حکم چند نے قسمیں لے کر لڑکی کو چھوڑ دیا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی ساڑھی کو جھاڑا اور درست کیا۔ نوکروں کے کوارٹرز سے خدمتگار اور خاکروب لالٹین لے کر آئے اور زور زور سے باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور کار کو چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی سامنے کی ہیڈ لائٹ سے بنگلے کا اگلا حصہ جگمگا اٹھا۔

O

صبح ڈکیتی کے بعد ریلوے اسٹیشن پر روز مرہ سے زیادہ بھیڑ تھی۔

منوں مجرا کے کچھ لوگوں نے یہ عادت بنا لی تھی کہ وہ 10:30 بجے والی پسنجر گاڑی کو دیکھنے کیلئے اسٹیشن پر رکے رہتے جو کہ دہلی سے لاہور آتی تھی۔ وہ ان چند مسافروں کو دیکھنا پسند کرتے تھے جو کہ منوں مجرا سے سوار ہوتے اور اترتے تھے۔ اور وہ ٹرین کے بارے میں لوگوں کے دلائل سن کر محفوظ ہوتے تھے کہ آج ٹرین دیر سے کیوں پہنچی تھی اور آخری دفعہ کب وقت پر آئی تھی۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے اس کی دلچسپی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اب گاڑیاں اکثر چار یا پانچ گھنٹے دیر سے آنے لگی تھیں اور کبھی کبھار بیس گھنٹے لیٹ ہوتیں۔

جب ٹرین آتی تو پاکستان سے آنے والے سکھ اور ہندو مہاجروں سے بھری ہوتی یا ہندوستان سے جانے والے مسلمانوں سے۔ لوگوں نے اپنی ٹانگیں لٹکا کر چھتوں پر بسیرا کیا ہوتا تھا یا بوگیوں کے درمیان میں لگے بستروں کے کناروں پر۔ جس کو جہاں جگہ ملتی وہ وہیں سما جاتا۔ پچھلے دنوں کے مقابلے میں ٹرین آج صبح صرف ایک گھنٹہ دیر سے پہنچی۔

جب وہ گرم تھی تو پلیٹ فارم پر پھیری والوں کے چیخنے کی آوازیں اور مسافروں کا تیزی سے جانا آنا اور ایک دوسرے سے چلا کر بات کرنا اس بات کا اظہار کر رہا تھا کہ بہت سے لوگ نکل رہے ہیں لیکن جب گارڈ نے گاڑی چلنے کیلئے اپنی سیٹی بجائی تو بہت سے لوگ گاڑی میں واپس آ گئے۔

صرف ایک اکیلا کسان آہنی نسل کے بانس اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی بیوی اس کے ساتھ ایک شیرخوار بچے کو اپنے کولھے پر آرام دینے کی غرض سے لئے ہوئے تھی۔ پھیری والے پلیٹ فارم پر رہ گئے تھے۔

اس آدمی نے اپنے گول بستر کو سر پر اٹھا لیا اور ایک ہاتھ سے اسے پکڑے رکھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے مکھن کا ایک بڑا سا ٹین کا ڈبہ اٹھا رکھا تھا۔ بانسوں کا گٹھا جو اس نے بغل میں دبایا ہوا تھا ایک سرے سے زمین سے گھسیٹتا جا رہا تھا۔ دو سبز ٹکٹ اس کی مونچھوں سے نیچے منہ میں دبے ہوئے تھے۔ عورت نے اسٹیشن کے گرد لگے ہوئے

لوہے کے جنگلے کا بغور مشاہدہ کیا۔ اور اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ وہ اپنے شوہر کے پیچھے چل رہی تھی اور اس کی جوتی بجری کنکر کو ٹھوکریں مارتی ہوئی گزر رہی تھی اور اس کے چندی کے زیورات چھن چھن کر رہے تھے۔

سٹیشن ماسٹر نے کسان کے منہ سے ٹکٹ پکڑ لئے اور دونوں کو گیٹ سے جانے دیا۔ وہاں جہاں وہ سب سے گلے ملنے اور مبارک باد وصول کرنے کیلئے بے قرار تھے۔ گارڈ نے دوسری بار سیٹی بجائی اور سبز جھنڈی لہرائی تب ہی انجن کے پیچھے سے ایک الگ ڈبے میں سے مسلح سپاہی باہر نکلے۔ وہ بارہ تھے اور انکے ساتھ ایک سب انسپکٹر تھا۔ انہوں نے رائفلیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ اور ان کی بھوری فوجی پٹی میں گولیاں بھری ہوئی تھیں دو نے زنجیریں اور ہتھکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

ٹرین کے آخری حصے ۔گارڈ وین کے قریب سے ایک جوان آدمی باہر آیا۔ اس نے ایک لمبی سفید قمیض کھردرے کاٹن کی بھورے رنگ کی واسکٹ اور ڈھیلا سا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے بستر بند اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اپنے بکھرے بالوں کو درست کرتا ہوا احتیاط سے ٹرین سے باہر نکلا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا سا دبلا پتلا آدمی تھا اور دیکھنے میں نامرد لگ رہا تھا۔

پولیس والوں کو دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے اپنا بستر بند بائیں کندھے پر رکھ لیا۔ اور تیزی سے باہر نکلنے کیلئے چل پڑا۔

گاؤں والے جوان آدمی کو دیکھنے لگے۔ اور پولیس پارٹی اسٹیشن ماسٹر کی مخالف سمت میں چل پڑی جو کہ گیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

اس نے پولیس کیلئے اسے پورا کھول دیا اور خوشامد کرنے لگا۔

جوان آدمی سب سے پہلے گیٹ پر پہنچا اور اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے درمیان آ کر رک گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے اس سے ٹکٹ لے لیا۔ لیکن جوان آدمی نہ تو آگے بڑھا اور نہ ہی سب انسپکٹر کیلئے راستہ بنایا۔

کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب کہ اس گاؤں میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں قیام کرسکوں۔

اسٹیشن ماسٹر کو غصہ آ گیا۔ لیکن آنے والے کا مہذب انداز۔ اس کی ظاہری آرائش' لباس اور بستر بند نے اسٹیشن ماسٹر کو اپنا غصہ ضبط کرنے پر مجبور کیا۔ منھوں مجرا میں کوئی ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ اس نے طنزیہ انداز میں نرمی سے کہا۔ ''یہاں صرف سکھوں کا مندر ہے۔ تم گاؤں کے بیچ میں پیلے رنگ کا جھنڈا لہراتا دیکھو گے''

''آپ کا شکریہ۔ جناب!''

پولیس پارٹی اور اسٹیشن ماسٹر نے اس جوان کی بے ہمتی سے جانچ پڑتال کی۔
اس علاقے میں بہت زیادہ لوگ تھینک یو نہیں کہتے تھے۔ تھینک یو۔ کہنے والوں میں سے اکثر غیر ملکی پڑھے لکھے لوگ تھے۔

انہوں نے بہت سے کھاتے پیتے جوان آدمیوں کو کسانوں کا مخصوص لباس پہن کر دیہی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہوئے سنا تھا جنہوں نے انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

جن میں سے کچھ کیمونسٹ ایجنٹ کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جن میں سے کچھ لکھ پتیوں اور کچھ بڑے سرکاری افسروں کے بیٹے تھے۔

وہ سب مشکل حالات کو دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک محتاط تھا۔

جوان اسٹیشن سے باہر نکل کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ باوقار چال ڈھال کے ساتھ چندگز کے فاصلے سے پولیس والوں کے سامنے سے چلتا ہوا گیا۔ اسے ان کی موجودگی کا احساس تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں ہونے والی کھجلی اسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہے تھے اور اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس نے نہ کھجلی کی اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

اس نے سکھوں کا جھنڈا دیکھا جو کہ تین کونوں والے پیلے کپڑے سے بنایا گیا تھا۔ مٹی کی جھونپڑیوں کے درمیان میں لہرارہا تھا۔ جھنڈے کے اوپر کالے رنگ کا سکھوں کا نشان تھا۔ جس میں چلتا ہوا خنجر اور دو تلواریں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کچے راستے کے ساتھ چلتا گیا جس کی دوسری طرف ناشپاتی کی خاردار جھاڑیاں تھیں جو کہ کھیتوں کیلئے باڑ کا کام دے رہی تھیں۔

راستہ خراب ہو چکا تھا۔ یہ تنگ راستہ مٹی کی جھونپڑیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا زمیندار کے گھر کے پاس کھلا۔ مسجد اور مندر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

پیپل کے درخت کے نیچے لکڑی کے تختے پر گاؤں کے چھ لوگ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے پولیس کے آدمی دیکھے وہ کھڑے ہو گئے اور وہ انہیں رام لال کے گھر لے گئے۔

اس اجنبی کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں سوچا۔ وہ مندر کے کھلے دروازے سے اس کے صحن میں چلا گیا۔

داخلے کے راستے کے عین آخر میں ایک بڑا سا ہال تھا جہاں الہامی کتابیں' گرنتھ مخمل کے استر کے ساتھ بھڑکیلے سلک میں لپٹی ہوئی رکھی تھیں۔ ایک طرف دو کمرے تھے۔ اینٹوں کی ایک سیڑھی دیوار کے ساتھ ساتھ کمروں کی چھت پر جا رہی تھی۔ صحن کے درمیان میں کنویں کے ساتھ ایک اونچی منڈیر تھی۔

کنویں کے ساتھ ایک چار فٹ کا اینٹوں کا ستون تھا جو کہ جھنڈے کو سنبھال رہا تھا جس کو پیلے کپڑے سے ذخیرے کی مانند چھپایا گیا تھا۔

جوان آدمی نے ان میں سے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ وہ گیلے کپڑے کی آواز سن سکتا تھا جو کہ پتھر کی سل پر مارنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بزدلی سے چلتا ہوا کنویں کی دوسری طرف گیا ایک بوڑھا سکھ اپنی داڑھی اور سفید نیکر میں سے پانی ٹپکاتا ہوا اٹھا۔

ست سری کال۔

ست سری کال۔

کیا میں یہاں دو یا تین دن قیام کر سکتا ہوں۔

یہ گردوارہ ہے۔ گرو کا گھر۔ یہاں کوئی بھی رہ سکتا ہے۔ لیکن تمہیں اپنا سر ڈھانپ کر رکھنا ہوگا اور تم اندر کسی قسم کی کوئی سگریٹ' تمباکو نہیں لا سکتے نہ پی سکتے ہو۔

میں سگریٹ نہیں پیتا۔ جوان آدمی نے بستر زمین پر رکھتے ہوئے کہا اور اپنے سر پر رومال رکھ لیا۔ نہیں بابو صاحب۔ جب آپ اندر کتابوں کے قریب جائیں تو اپنے جوتے باہر اتاریں اور اپنا سر ڈھانپیں۔ اپنا سامان سفر اس کمرے میں رکھ دیں اور آرام

کریں۔ کیا آپ کانا کھائیں گے؟

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے۔ لیکن میں اپنا کھانا ساتھ لایا ہوں۔ بوڑھے آدمی نے آنے والے کو فالتو کمرہ دکھایا اور دوبارہ کنویں کی طرف چلا گیا۔

جوان آدمی نے کمرے کے اندر جا کر اچھی یرح کمرے کا جائزہ لیا۔ فرنیچر کے طور پر کمرے کے درمیان میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے اوپر ایک بڑا سا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ یہ گرو کی تصویر تھی جو کہ اپنے ہاتھ میں باز بٹھائے ہوئے گھوڑے پر سوار تھے۔

کیلنڈر کے ساتھ ہی کپڑے لٹکانے کیلئے کیلیں لگی ہوئی تھیں۔

جوان آدمی نے اپنا بستر بند خالی کیا۔ اس نے اپنا ہوائی گدا نکالا اور چارپائی پر بچھا دیا۔ اس نے پاجامہ اور سلک کا پہننے والا گون نکال کر گدے پر رکھ دیا۔

اس نے مچھلی کا ڈبہ۔ آسٹریلین مکھن اور ایک خشک بسکٹوں کا پیکٹ نکالا۔ اس نے اپنی پانی کی بوتل ہلا کر دیکھی وہ خالی تھی۔ بوڑھا سکھ اپنی لمبی داڑھی پر انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اسکی طرف آیا۔

اس نے نیچے دہلیز پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ تمہارا کیا نام ہے؟ اقبال۔ اور تمہارا نام۔

اقبال سنگھ؟ بوڑھے نے شک کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔ جواب کا انتظار کیے بغیر بوڑھے نے بولتے ہوئے کہا۔ میں اس مندر کا بھائی ہوں۔ بھائی میت سنگھ تمہارا منوں مجرا میں کیا کاروبار ہے۔ اقبال سنگھ؟

میت سنگھ نے پوچھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کون سا اقبال ہے۔

وہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ اقبال محمد۔

وہ ہندو ہو سکتا ہے۔ اقبال چند۔

یا سکھ۔ اقبال سنگھ۔ یہ ان ناموں میں سے ایک تھا جو تینوں اقوام میں عام تھا۔

سکھوں کے گاؤں میں ایک اقبال محمد یا ایک اقبال چند کے مقابلے میں اقبال سنگھ کے

ساتھ اچھا سلوک ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا ہوگا۔ چاہے اس کے بال کٹے ہوئے اور اس کی داڑھی مونڈھی ہوئی تھی۔

اس میں خود بہت کم مذہبی احساس تھا۔ میں ایک سوشل ورکر ہوں۔ بھائی جی۔

اس گاؤں میں بہت کچھ کرنے کو ہے۔ بٹوارہ کے بعد سے یہاں بہت قتل و غارت ہو رہا ہے۔ کسی کو تو اس کو روکنے کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔

میری پارٹی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ جب سے یہ جگہ پناہ گزینوں کی آمد و رفت کیلئے اہم نقطہ بنی ہے۔ یہاں پر خرابیاں بڑھ گئی ہیں۔ بھائی جی۔ کو اقبال کے پیشے میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آ رہی تھی۔

تم کہاں سے آئے ہو؟ اقبال سنگھ جی۔

میرا ضلع جہلم سے تعلق ہے جو کہ اب پاکستان میں ہے۔ لیکن میں ایک طویل عرصے سے بیرون ملک تھا۔ دنیا دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ ہم کتنے پسماندہ ہیں اور کسی کو اس کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔ اس لئے میں سوشل ورک کرتا ہوں۔ وہ تمہیں اس کے کتنے پیسے دیتے ہیں؟

اقبال نے ان سوالوں کا برا نہیں منایا۔

میں ان سے کچھ زیادہ وصول نہیں کرتا۔ صرف اپنے اخراجات کیلئے لیتا ہوں۔

کیا وہ تمہاری بیوی اور بچوں کے اخراجات کیلئے کچھ دیتے ہیں۔

نہیں بھائی جی۔ میں شادی شدہ نہیں ہوں

سچ سچ تمہاری عمر کتنی ہے۔

ستائیس سال۔

مجھے بتایئے کہ کیا اس گاؤں میں اور سوشل ورکرز آئے ہیں۔ اقبال نے میت سنگھ کی تفتیش کو روکنے کیلئے سوالات کرنے کا فیصلہ کیا۔

کبھی کبھار امریکی پادری آتے ہیں۔

کیا آپ اپنے گاؤں میں عیسائیوں کی تبلیغ کو پسند کرتے ہیں ہر کوئی اپنے مذہب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ یہاں دوسرا دروازہ مسلمانوں کی مسجد کا ہے۔

جب میں اپنے گرو کی پوجا کرتا ہوں۔ چچا امام بخش اللہ کو پکارتے ہیں۔ یورپ میں کتنے مذاہب ہیں؟

وہ سب عیسائی ہیں۔

وہ ہماری طرح اپنے مذہب کیلئے لڑتے نہیں۔ درحقیقت وہ اپنے مذہب کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے

میں سن چکا ہوں۔ میت سنگھ نے بیزاری سے کہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی اخلاق نہیں۔ صاحب اور ان کی بیویاں دوسروں کے صاحب اور ان کی بیویوں کے ساتھ جاتے ہیں۔

یہ اچھی بات نہیں۔ کیا ہے؟

لیکن وہ ہماری طرح جھوٹ نہیں بولتے اور نہ ہی وہ رشوت خور اور بد دیانت ہوتے ہیں جیسے کہ ہم میں سے بہت سے ہوتے ہیں۔ اقبال نے جواب دیا۔ اس نے ٹین کو کھولا اور اس میں سے سارڈین (مچھلی) نکال کر بسکٹ کے اوپر رکھی اور کھانے کے دوران میں باتیں جاری رکھیں۔

اخلاقیات۔ میت سنگھ جی۔ پیسے کا چکر ہے۔ غریب لوگ اخلاق کے مقدور نہیں ہو سکتے۔ ہمارا پہلا مسئلہ لوگوں کو خوراک اور لباس مہیا کرنا ہے۔ یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہے کہ جب امیر لوگوں کی طرف سے ناجائز انتقام کی روک تھام ہو اور زمینداری کا اختتام ہو۔ اور یہ سب کچھ حکومت کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے۔

میت سنگھ کراہت سے نوجوان آدمی کو سالم مچھلی کھاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیہی ترقی' قومی آمدن کی اوسط اور سرمایہ داروں کی ناجائز آمدنی کے لیکچر کی طرف کوئی توجہ نہ دی جبکہ دوسری طرف اس نے خشک بسکٹوں کا چوتھائی حصہ بھی کھا لیا۔

جب اقبال نے کھانا ختم کیا تو میت سنگھ اٹھا اور اس کیلئے اپنی صراحی میں سے پانی لایا۔ اقبال نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

جب بھائی جی باہر گئے تو اس نے اپنی آواز بلند کر لی۔ اقبال نے اپنی جیب سے سیلوفین کاغذ کا ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر اس میں سے ایک سفید گولی نکالی اور اسے

گلاس میں ڈال دیا۔

وہ میت سنگھ کے انگوٹھے کو پانی میں ڈوبا دیکھ چکا تھا۔ جس کے ناخن کے نیچے گندگی کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ کسی بھی صورت میں یہ ٹھیک نہیں تھا کیونکہ اس میں کلورین نہیں ڈلی ہوئی تھی۔

کیا تم بیمار ہو؟

بوڑھے آدمی نے نوجوان کو گولی کے گھلنے کا انتظار کرتے دیکھ کر کہا۔

نہیں۔ یہ میرا کھانا ہضم کرنے میں میری مدد کرتی ہے ہم شہر کے رہنے والوں کو کھانے کے بعد اس قسم کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اقبال نے اپنی تقریر کا دوبارہ آغاز کیا۔

اس میں سب کچھ شامل ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

یہاں کا پولیس کا نظام جو کہ لوگوں کو تحفظ دینے کی خاطر بنایا گیا ہے۔ ان کے ساتھ برا برتاؤ کر رہا ہے اور خود بدعنوانی اور رشوت خوری پر چل رہا ہے۔

مجھے یقین ہے۔ آپ یہ سب کچھ جانتے ہوں گے۔ بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی رائے دیتا۔ اقبال دوبارہ بولنا شروع ہو گیا۔ پولیس کی ایک پارٹی ایک انسپکٹر کے ساتھ میرے ساتھ ہی ٹرین سے یہاں اتری ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے سارا مرغا کھا لیا ہو گا۔ انسپکٹر نے رشوت میں کچھ پیسہ لیا ہو گا اور اب وہ کسی دوسرے گاؤں کی طرف گئے ہوں گے۔

ایک بات سوچنے کی ہے کہ ان کو کوئی کام نہیں سوائے لوگوں کو لوٹنے کے۔

پولیس کے حوالے سے ہونے والی باتوں نے بوڑھے آدمی کے سوئے دماغ کو جگا دیا۔

یعنی کہ پولیس آ چکی ہے۔ میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ ضرور زمیندار کے گھر ہوں گے۔ وہ پچھلی رات قتل ہو چکا ہے۔ گوردوارے کے قریب ڈاکو بہت سا نقد روپیہ لوٹ کر لے گئے اور کہتے ہیں کہ وہ چاندی کے پانچ ہزار دینار اور [illegible] بیوی سے سونے کی زیورات بھی لے گئے۔ میت سنگھ نے اپنی دلچسپی کو کم کر کے

آہستہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے جانا چاہیے۔ سارا گاؤں وہاں ہو گا۔

وہ لاش کو پوسٹمارٹم کیلئے لے جائیں۔ اگر آدمی مرا ہو گا تو وہ اس وقت تک نہیں جلایا جائے گا جب تک کہ ڈاکٹر اسے مرا ہوا قرار نہیں دے گا۔ بوڑھے آدمی نے ایک طرف سے ہلکی سی مسکراہٹ دی۔ قتل کیوں۔

وہ قتل۔ کیوں ہوا تھا؟ اقبال نے الجھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ حیران تھا کہ میت سنگھ اپنے ساتھ والے ہمسائے کے قتل سے اب تک بے خبر تھا۔

کیا وہ کیمونل Communal ہے۔ میرے لئے یہی درست ہے کہ میں یہاں رک جاؤں۔

میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اگر گاؤں والے قتل کے بارے میں جذباتی ہیں تو میں کچھ کر سکتا ہوں۔

کیوں۔ بابو صاحب۔ آپ تو یہاں قتل و غارت روکنے آئے ہیں اور آپ ایک ہی قتل سے پریشان ہو گئے لیکن آپ منوں مجرا میں مکمل محفوظ ہیں۔

اس نے مزید بولتے ہوئے کہا۔ ڈاکو ایک گاؤں میں سال میں ایک دفعہ ہی آتے ہیں۔

کچھ دنوں میں کسی اور گاؤں میں ڈاکہ پڑے گا اور ہم اس ایک ڈاکے کو بھول جائیں گے۔ میں واپس آ کر تمہیں بتاؤں گا کہ کیا ہوا ہے۔ بوڑھا آدمی لنگڑاتا ہوا صحن سے باہر نکل گیا۔ اقبال نے خالی ڈبے۔ اپنے چھری، کانٹے اور ٹین کی پلیٹیں اکٹھی کیں اور انہیں کنوئیں کے پاس دھونے کیلئے لے گیا۔

دوپہر کو اقبال کھردری ستلی کی بنی چارپائی پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے رات اپنے بستر بند پر بیٹھ کر تھرڈ کلاس حصے میں بھیڑ میں گزاری تھی۔ سارا وقت وہ اونگھتا رہا تھا۔ گاڑی جب راستے میں اسٹیشن پر رکی تو کچھ کسان اپنی بیویوں

کے ساتھ بسترے اور ٹین کے ڈبے اٹھائے ہُوئے سوار ہو گئے تھے۔

کچھ بچے اپنی ماؤں کی آغوش میں روتے ہوئے سو گئے۔ جب تک کہ ان کی ماؤں نے ان کے منہ میں اپنا دودھ نہیں دے دیا۔ ٹرین کے اسٹیشن چھوڑنے کے بعد بھی کافی دیر تک چیخوں اور فریادوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک ہی چیز بار بار ہو رہی تھی۔ گاڑی کے اس حصے میں پچاس لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی لیکن اس میں دو سو سے زیادہ لوگ تھے۔ جو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سیٹ پر' سامان سفر کے خانے میں۔ ٹرنک پر' بستر بند پر اور ایک دوسرے پر۔ یا کونوں میں کھڑے ہوئے۔ وہاں درجنوں نے غیر یقینی کیفیت میں دروازوں کے ہینڈل پکڑ کر ڈبے کے پائیدان پر بسیرا کیا ہوا تھا۔

بہت سے لوگ چھت پر تھے۔ مار دینے والی گرمی اور بدبو تھی۔ مزاج بگڑے ہوئے تھے اور ہر چند منٹ بعد دلائل و بحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا کیونکہ ان میں سے کوئی ایک پھیل کر بیٹھ جاتا تھا یا لیٹرین کے راستے میں کسی کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا جاتا تھا۔

یہ بحث ہوتے ہوتے دوستوں' رشتے داروں اور باقی دوسروں تک جوڑ جاڑ کر پہنچا دی جاتی۔ پتنگے جو کہ گلوب کے اردگرد پھڑ پھڑا رہے تھے اقبال نے ان پتنگوں کے سائے کے دھبوں کی ہلکی سی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی۔

اس نے مشکل سے ایک پیراگراف پڑھا تھا کہ اس کے ساتھ والے نے اسے بغور دیکھنا شروع کر دیا۔

آپ پڑھ رہے ہیں؟

ہاں میں پڑھ رہا ہوں۔

آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟

ایک کتاب۔

یہ اس کام کا وقت نہیں' اس آدمی نے آرام سے اقبال کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور اس کے صفحے موڑ دیئے۔

انگریزی؟

ہاں۔ انگریزی

آپ ضرور پڑھے لکھے ہیں۔

اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔

کتاب چھان بین کیلئے پورے ڈبے میں گئی۔

وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے

وہ پڑھا لکھا تھا اس لئے وہ کسی اور کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک بابو تھا۔

آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟

میرا نام اقبال ہے۔ اللہ آپ کا اقبال اور بلند کرے۔ سب دیکھنے والے اسے مسلمان سمجھ رہے تھے۔

پاکستان کو جانے والے راستے کے تمام مسافر مسلمان لگ رہے تھے۔

آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ بابو صاحب' میرا غریب خانہ ضلع جہلم میں ہے۔

اقبال نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔

اس کے جواب نے اس بات کی مزید توثیق کر دی کہ وہ غالباً مسلمان ہے۔

اس کے بعد تمام مسافر جرح کرنے لگے۔

اقبال نے ان کو بتایا کہ وہ کیا کرتا ہے' اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا۔ اس کے پاس کتنی دولت تھی؟ اس نے کہاں سے تعلیم حاصل کی تھی؟ اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ ان کی طرف سے ملنے والی تمام پریشانیاں اس نے برداشت کیں۔

وہ اپنے ذاتی مسائل اور بیماریوں کو بھی اس کے ساتھ زیر بحث لائے۔ اور اس کی نصیحتوں کو بھی پسند کیا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا اقبال پوشیدہ نسخوں اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں جانتا تھے جو کہ انگریزوں کے استعمال میں آتے ہیں۔

اقبال نے انہیں سونے یا پڑھنے کی کوشش کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن انہوں نے اپنی باتیں صبح ہونے کے بعد تک جاری رکھیں۔ اس نے ہندوستان کے ناقابل برداشت سفر کی تکالیف کے بارے میں بتایا جس کی انتہا انسان کی برداشت سے باہر تھی۔ الفاظ اس کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔

منوں مجرا پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لے رہا

تھا۔ وہ آگے طویل قیلولے کا سوچ رہا تھا۔ لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ کمرے میں سے ہوا کا گزر بالکل نہ تھا۔ اتنے میں میت سنگھ کی آواز سنائی دی۔

دنیا سے اخلاق تو ختم ہو گیا ہے۔

اقبال نے اپنے چہرے پر سے رومال ہٹا کر پوچھا۔ کیا ہوا ہے؟

کیا ہوا ہے؟ میت سنگھ نے حیران ہوتے ہوئے دوبارہ کہا۔

مجھ سے پوچھو کہ کیا نہیں ہوا ہے؟

پولیس جگا کے پیچھے گئی ہے۔ جگا ایک دس نمبری بدمعاش ہے۔ لیکن جگا بھاگ چکا ہے۔ فرار ہے۔

ڈکیتی کے سامان میں سے ایک تھیلا اس کے صحن میں سے ملا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس نے کیا ہے۔ یہ اس کا کوئی پہلا قتل نہیں ہے۔ یہ تو اس کے خون میں شامل ہے۔ اس کا باپ اور دادا بھی ڈاکو تھے اور قتل کے الزام میں پھانسی چڑھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنے گاؤں کو نہیں لوٹا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب وہ گھر پر ہوتے تھے تو کوئی بھی ڈاکومنوں مجرا آنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ جگت سنگھ نے اپنے خاندان کو ذلیل کروا دیا۔

اقبال نے رگڑ کر اپنا ماتھا صاف کیا۔ اس کے اخلاقی معیار کی گفتگو نے ہمیشہ اسے پریشان کیا تھا۔ پنجابی ضابطہ قانون کو ہمیشہ سے توڑتے آئے ہیں۔ ان کیلئے سچائی' نیک نامی' مالی پختگی صرف ٹھیک ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں جتنی کہ ایک نمک کی ہے جو اپنے دوستوں اور گاؤں والوں کیلئے کرتے ہیں۔

دوستوں کیلئے تم عدالت میں جھوٹ بول سکتے ہو یا دھوکہ دے سکتے ہو اور کوئی تمہیں الزام نہیں دے گا۔ اس کے برعکس تم ایک نر آدمی بن جاؤ گے۔ ماسٹر فل مین۔ جو کہ اختیارات کا مالک ہو۔

یہ دیہی معاشرے کا ایک حصہ تھا۔ جہاں گاؤں سے کسی کا تعلق اور وفاداری' ایک بڑا امتحان ہوتا تھا' میت سنگھ ایک گرنتھی کو یہ بات پریشان نہیں کر رہی تھی کہ جگا نے قتل کیئے تھے بلکہ یہ بات اسے تکلیف دے رہی تھی کہ اس نے اپنے گاؤں والوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ اگر جگا یہ سب کچھ ساتھ والے گاؤں میں کرتا تو میت سنگھ

بڑی خوشی سے اس کے بچاؤ کیلئے گواہی دیتا اور پاک گرنتھ کی قسم کھا کر کہتا کہ قتل کے وقت جگا گردوارے میں پوجا کر رہا تھا۔

اقبال' میت سنگھ جیسے لوگوں کی باتوں سے اکتا چکا تھا۔ وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ان سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ میت سنگھ ناامید ہو گیا تھا کہ وہ اقبال کی دلچسپی کو نہ بڑھا سکا۔

''تم نے دنیا دیکھی ہے اور بہت سی کتابیں پڑھی ہیں لیکن یہ مجھ سے سن لو کہ سانپ اپنی کھال بدل سکتا ہے اپنی ذات نہیں۔ اس کہاوت کی سینکڑوں ہزاروں روپے کی قیمت ہے۔''

اقبال نے اس کی اس بات کی کوئی قدر نہیں کی۔

میت سنگھ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

کبھی جگا سیدھے راستے پر چلتا تھا۔ وہ اپنی زمین میں ہل چلاتا اور اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا' اب وہ کبھی بھی گاؤں نہیں چھوڑ سکتا اسے روزانہ نمبردار کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ایک سانپ کتنا عرصہ سیدھا چل سکتا ہے؟ جبکہ اس کے خون میں جرم شامل ہو۔

''کسی کے خون میں جرم شامل نہیں ہوتا جس طرح کہ کسی کے خون میں نیکی شامل نہیں ہوتی۔'' اقبال نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

یہ اس کی بچوں جیسی سوچ تھی کیا کوئی یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ چوری اور قتل کیوں کرتے ہیں؟

''نہیں! وہ جیل میں ڈال دیئے جاتے ہیں یا پھانسی لٹکا دیے جاتے ہیں کیونکہ یہ آسان ہے۔''

اگر پھانسی یا جیل کا خوف ختم کر دیا جائے تو کیا لوگ قتل کرنے یا چوری کرنے سے باز آ جائیں گے۔ کوئی قتل یا چوری نہیں ہو گی۔ یہ نہیں ہوتا۔

اس صوبے میں ہر روز ایک آدمی کو پھانسی دی جاتی ہے تب بھی چوبیس گھنٹوں میں دس قتل ہوتے ہیں۔

نہیں بھائی جی۔ مجرم پیدا نہیں ہوتے۔ وہ بھوک' افلاس اور نا انصافی کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔

اقبال نے محسوس کیا کہ وہ فرسودہ سچ کے بارے میں بولتا ہوا تھوڑا بے وقوف لگ رہا ہے۔

اسے اپنی اس عادت کو بدلنا چاہیے کہ وہ باتوں کو خطبے میں بدل دیتا ہے۔ وہ مضمون کو ہی بدل دیتا ہے۔

فرض کریں کہ اگر جگا اچھے کردار کا مالک جانا جاتا ہو تو اسے آسانی پکڑا جا سکے گا۔

جگا دور نہیں جا سکتا وہ پہچانا جا سکتا ہے اس کے ایک ہاتھ کی لمبائی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب پہلے ہی تمام پولیس اسٹیشن کو حکم بھیج چکے ہیں کہ جگا کو ڈھونڈا جائے۔

"ڈپٹی صاحب کون ہیں۔" اقبال نے پوچھا

"تم ڈپٹی کو نہیں جانتے؟" میت سنگھ حیران تھا۔ یہ حکم چند ہے۔ جو کہ پل کے شمال میں واقع ڈاک بنگلے میں مقیم ہے۔

زمین کی پھپھوندی کی خوشبو آ رہی تھی۔ جبکہ کونے میں پڑے ہوئے کپڑوں میں سے باسی مکھن جیسی بدبو آ رہی تھی۔ اور ہر طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اقبال نے اپنے چہرے پر رومال ڈال لیا۔ وہ مشکل سے سانس لے پا رہا تھا۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ابھی وہ صرف اونگھا ہی تھا کہ میت سنگھ فلسفیانہ انداز میں چیختا ہوا آیا۔

"اپنے گاؤں والوں کو لوٹنا تو ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں کی چوری کرے۔ اقبال سنگھ جی۔ یہ تو کل یگ ہے۔ اندھیر نگری ہے۔ کیا آپ نے کبھی ڈاکوؤں کو اپنے ہمسائیوں کے گھر میں ڈاکہ ڈالتے دیکھا ہے۔"

میت سنگھ کچھ توقف کے بعد بولا "اب حکم چند ایک پاور فل آدمی ہے۔

اس نے بحیثیت کانسٹیبل کے نوکری شروع کی تھی اور دیکھو اب وہ کہاں ہے۔ وہ

ہمیشہ اپنے صاحب کو خوش رکھتا تھا اور وہ اسے ایک کے بعد دوسری ترقی دے گئے۔ آخری افسر نے تو اسے اپنی جگہ دے دی اور اسے ڈپٹی بنا گیا۔ ہاں۔ اقبال سنگھ جی' حکم چند بہت اختیارات والا آدمی ہے اور چالاک بھی۔ وہ اپنے دوستوں سے سچا ہے اور ان کیلئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اس نے اپنے درجنوں رشتے داروں کو اچھی نوکریاں دی ہیں۔ وہ سو میں سے ایک ہے حکم چند کے بارے میں کوئی بناوٹ نہیں۔"

کیا وہ تمہارا دوست ہے؟ اقبال نے پوچھا۔

دوست؟ نہیں نہیں۔ میت سنگھ نے اپنی جان بچاتے ہوئے کہا۔ میں گردوارے کا ایک غریب مسکین بھائی ہوں اور وہ ایک بادشاہ ہے وہ حکومت ہے اور ہم اس کے ملازم ہیں۔ اگر وہ منوں مجرا آیا تو تم اسے ضرور دیکھ سکو گے۔

گفتگو میں کچھ وقفہ آیا۔ اقبال نے اپنی سینڈل میں اپنے پاؤں ڈالے اور کھڑا ہو گیا۔

مجھے ضرور واک پہ جانا چاہیے۔ بتائیے مجھے کون سے راستے پر جانا چاہئے۔"

"کسی بھی سمت میں جو تمہیں پسند ہو۔ یہ سارا آزاد ملک ہے۔ دریا کی طرف جاؤ۔ وہاں تم ٹرین کو آتا اور جاتا دیکھ سکو گے۔ اگر تم ریل کی پٹڑی پار کرو گے تو تم ڈاک بنگلہ دیکھ سکو گے۔ زیادہ دیر مت کرنا یہ برا دور ہے۔ اور بہتر ہے کہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر واپس آ جایا جائے۔ میں نمبردار اور چچا امام بخش کو بتا چکا ہوں وہ مسجد کے مولوی ہیں۔ کہ تم یہاں ہو۔ وہ بھی یہاں تم سے ملنے آ سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں دیر نہیں کروں گا۔" اقبال بولا وہ گردوارے سے باہر نکل گیا۔ اب وہاں کسی قسم کی کوئی سرگرمی کا نشان نہ تھا۔ پولیس کی ظاہری تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ پیپل کے درخت کے نیچے درجن سے زیادہ کانسٹیبل چارپائیوں پر پاؤں پسارے لیٹے تھے۔ رام لال کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ کچھ گاؤں والے صحن میں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت دردناک آواز میں گا رہی تھی۔ جو کہ آخر میں کھلبلی مچا دینے والی چیخ میں بدل جاتی تھی اور اس میں اور عورتیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔

یہ بہت گرم اور خاموش دن تھا۔ سورج کچی دیواروں پر شعلے بھڑکا رہا تھا۔ اقبال

گوردوارے کی دیوار کے سائے میں ٹہلنے لگا۔ بچوں نے اپنے آپ کو اس کے اردگرد چھوڑا ہوا تھا۔ مرد اسے پیشاب خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ایک گندی غلیظ کتیا اپنی جگہ پر اپنے آٹھ چھوٹے نرم نرم جلد والے پلوں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور وہ اس کے لٹکتے تھنوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پگڈنڈی اچانک گاؤں کے جوہڑ پر آ کر ختم ہوگئی۔ گندے پانی کا ایک جوہڑ جس میں بھینس اپنا سر باہر نکال رہی تھی۔ فٹ پاتھ جوہڑ کے کنارے واقع تھا۔ جو کہ خشک نالے کے ساتھ چلتا ہوا گندم کے کھیتوں کی طرف سے دریا کی طرف جا رہا تھا۔

اقبال اپنے پاؤں کو دیکھتے ہوئے خشک نالے کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ جیسے ہی وہ دریا کے کنارے پہنچا۔ لاہور سے آنے والی ایکسپریس ٹرین پل پر آ گئی۔ وہ اس کے اسٹیل کے اڑے ترچھے جال کی عمدگی کو دیکھ رہا تھا۔

دوسری گاڑیوں کی طرح یہ بھی بھری ہوئی تھی۔ چھت پر سے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف سے لوگ ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں سروں اور بازوؤں سے بند تھے۔ لوگ بوگیوں کے درمیان خالی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو آدمی ٹرین کے آخری حصے میں خالی جگہ پر بیٹھے ٹانگیں لٹکا کر خوشی خوشی ٹرین پر مار رہے تھے اور اشاروں میں باتیں کر رہے تھے۔ پل پار کرنے کے بعد ٹرین کی رفتار بڑھ گئی۔

انجن ڈرائیور نے سیٹی بجانی شروع کی اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک کہ وہ منوں مجرا اسٹیشن سے گزر نہیں گئی۔ یہ اس بات کا تاثر تھا کہ وہ اب پاکستان سے باہر ہیں اور ہندوستان میں ہیں۔ اقبال دریا کے کنارے کنارے پل کی طرف گیا۔ اس نے ڈاک بنگلے کی طرف جانے کیلئے اس کے نیچے جانے کا ارادہ بنایا۔

جب اسے اندازہ ہوا کہ ایک سکھ سپاہی پل کے آخر میں کھڑا سینٹری بکس سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اقبال نے اپنا ذہن بدل لیا اور بے خوفی سے پٹڑی کے ساتھ چلتا ہوا منوں مجرا اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔

اقبال کئی گز کے فاصلے پر جانے کے بعد یونہی ریلوے لائن پر بیٹھ گیا۔ گزرتی ہوئی ایکسپریس نے منوں مجرا کو اس کے طویل قیلولے سے بیدار کر دیا۔ لڑکوں نے

جوہڑوں میں موجود بھینسوں پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور انہیں گھر کی طرف لے کر چل دیئے۔

عورتوں کا ٹولہ کھیتوں میں پہنچ گیا اور جھاڑیوں میں بکھر گیا۔

ایک بیل گاڑی رام لال کی فصل اٹھائے گاؤں سے باہر اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ پولیس کے آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ بہت سے گاؤں والے اس کے ساتھ تھوڑی دور تک گئے اور پھر اپنے رشتے داروں کے ساتھ واپس آ گئے۔

اقبال کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ریلوے اسٹیشن سے لیکر ریسٹ ہاؤس کی چھت تک سجاوٹ دکھائی دے رہی تھی پل سے لیکر گاؤں تک اور واپس ریلوے اسٹیشن تک۔ سارے علاقے میں مرد، عورتیں، بچے، مویشی اور کتے بکھرے ہوئے تھے۔

پتنگیں آسمان پر اونچی اڑان اڑ رہی تھیں کوؤں کی ایک لمبی قطار ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی۔ لاکھوں چڑیا درختوں پر چہچہا رہی تھیں۔

انڈیا میں کون ایک ایسی جگہ ڈھونڈ سکتا ہے جو زندگی سے بھرپور ہو۔ اقبال نے اپنے بمبئی پہنچنے کے بعد کے تاثر کے بارے میں سوچا۔

مل کے ہجوم میں سے لاکھوں گھاٹ پر سڑکوں پر ریلوے پلیٹ فارم پر چلے جاتے ہیں۔ رات تک اکا فٹ پاتھ لوگوں سے بھر جاتا ہے۔ پورا ملک ایک ہجوم سے بھرے کمرے کی مانند تھا جب آبادی میں اضافہ ہر ایک منٹ میں چھ بچے یا ایک سال میں پچاس لاکھ کی اوسط سے ہو تو آپ کیا امید کر سکتے ہیں۔ یہ اضافہ صنعتی اور زرعی پلاننگ کو مذاق بنا دیتا ہے۔

اتنا ہی پیسہ آبادی میں اضافے کی روک تھام کی کوشش میں خرچ کیوں نہیں ہوتا۔ لیکن کما سترا کی زمین پر آپ یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ ایک پوجا اور دینی رسوم کرنے والے کے گھر میں۔ اقبال اپنے دن میں دیکھے گئے ناراض خوابوں سے ریلوے لائن پر سے گزرتے ہوئے اسٹیل کے تاروں کی ہلکی ہلکی آواز کی وجہ سے جاگ گیا۔ پل کے قریب سنتری بکس کا سگنل گر گیا۔ اقبال کھڑا ہوا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

دریا کے اس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان جہاز کے اردگرد پھیلی ہلکی روشنی

سے سرمئی رنگ میں بدل گیا۔ ایک نیا چاند شام کے ستارے کے ساتھ ظاہر ہوا جو کہ دیکھنے
میں انگلی کے تراشے گئے ناخن کی مانند تھا۔

ٹرین کی پٹڑی کی رگڑ کی آواز میں مؤذن نے نماز کیلئے اذان دی۔ اقبال نے
اپنا واپسی کا راستہ بآسانی پالیا۔ تمام پگڈنڈیاں ایک مثلث کی طرح مندر، مسجد اور زمیندار
کے گھر تک جاتی تھیں اور ان کے درمیان میں ایک پیپل کا درخت تھا۔ رام لال کے گھر
سے دردناک چیخوں کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔

مسجد میں درجن کے قریب نمازی دو قطاروں میں خاموشی سے کھڑے رکوع کی
طرف جا رہے تھے۔
لپٹی ہوئی تھی۔ وہ زبانی شام کی عبادت کر رہا تھا۔ پانچ یا چھ مرد عورتیں لالٹین کے گرد بیٹھے
ہوئے تھے اور اسے سن رہے تھے۔

اقبال سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اور اندھیرے میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔
جب پجاریوں نے بھجن گانا شروع کیا اقبال نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

سسری کال اور ڈرم پیٹنے کی آوازوں کے بعد یہ سالانہ جلسہ ختم ہو گیا مرد اور
عورتیں باہر آ گئے۔ میت سنگھ نے لالٹین پکڑی اور انہیں جوتیاں تلاش کرنے مین ان کی مدد
کی۔ انہوں نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ اس شور میں اقبال صرف ایک ہی لفظ سن
سکا۔ بابو، کچھ لوگ جنہوں نے اقبال کے اندر آنے کا نوٹس لیا تھا۔ دوسروں کو اس کے
بارے میں بتانے لگے۔ کچھ کانا پھوسی کرنے اور پاؤں کے رگڑنے کی آوازیں آئیں پھر
مکمل خاموشی ہوگئی۔

اقبال نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک منٹ بعد ہی میت سنگھ
لالٹین پکڑے دہلیز پر کھڑا تھا۔ اقبال سنگھ جی! کیا آپ کھانا کھائے بغیر ہی سو رہے تھے؟
کیا آپ پالک کھانا پسند کریں گے۔ میں دہی مکھن اور دودھ بھی لایا ہوں۔

''نہیں۔ آپ کا شکریہ بھائی جی۔ جو میں کھانا چاہتا تھا۔ کھا چکا ہوں''

ہمارا غریب کھانا آپ کہاں کھائیں گے۔ میت سنگھ شروع ہو گیا۔

''نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔'' اقبال نے بیٹھ کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔
بات صرف اتنی ہے کہ میں کھا چکا ہوں اور اگر میں نے یہ نہ کھایا تو یہ ضائع
ہو سکتا ہے۔ میں تھوڑا تھک چکا ہوں اور سونا چاہوں گا۔

تو پھر آپ تھوڑا دودھ پی لیں۔ بنتا سنگھ۔ نمبردار، آپ کو لا دیتا ہے۔ اگر آپ
جلدی سونا چاہتے ہیں تو میں اسے جلدی لانے کا کہہ دوں گا۔ میں نے آپ کیلئے چھت پر
ایک اور چارپائی ڈال دی ہے۔ سونے کیلئے یہ بہت گرم ہے۔ میت سنگھ لالٹین کمرے میں
چھوڑ گیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

نمبردار کے ساتھ کی جانے والی گفتگو زیادہ دلچسپ نہیں تھی۔ اقبال نے اپنے
تکیے کے نیچے سے ایک شراب کی بوتل نکالی اور ایک لمبا گھونٹ لیا اس نے چند خشک بسکٹ
کھائے جو کہ کاغذ کے پیکٹ میں تھے۔ وہ اپنی چٹائی اور تکیہ اٹھا کر چھت کی طرف چل پڑا
جہاں اس کیلئے ایک چارپائی بچھا دی گئی تھی۔

میت سنگھ گردوارے کی حفاظت کی غرض سے صحن میں سو گیا۔ اقبال اپنی چارپائی
پر لیٹ گیا اور آسمان کے کثیر تعداد ستاروں کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران اس نے گردوارے
مین داخل ہونے والوں کی بہت سی آوازیں سنیں۔ وہ ان کا خیر مقدم کرنے کیلئے اٹھ کھڑا
ہوا۔

ست سری کال۔ بابو صاحب۔ آپ کو سلام بابو صاحب۔

انہوں نے ہاتھ ملایا۔ میت سنگھ نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔ اقبال نے آنے
والوں کو بٹھانے کیلئے ہوائی چٹائی کھول کر چارپائی پر بچھا دی اور خود فرش پر بیٹھ گیا۔

میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ سے پہلے نہیں مل سکا۔ ایک سکھ نے کہا۔ مہربانی
فرما کر مجھے معاف کر دیں، میں آپ کیلئے تھوڑا دودھ لایا ہوں۔ ہاں صاحب ہم سب اپنے
آپ سے شرمندہ ہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔
دودھ پی لیں اس سے پہلے کہ ٹھنڈا ہو۔

آنے والوں میں سے ایک اور نے کہا۔ وہ داڑھی والا لمبا کمزور آدمی تھا۔
یہ آپ کی محبت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ پولیس کے ساتھ مصروف تھے۔

میں دودھ نہیں پیتا۔ واقعی میں نہیں پیتا ہم شہروں میں رہنے والے..........''

نمبردار نے اقبال کے ادب و آداب کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے ایک بڑے پیتل کے گلاس میں سے دودھ نکال کر زبردستی اس کے ہاتھ میں پکڑانے لگا۔'' یہ تازہ ہے۔ میں نے ایک گھنٹہ پہلے ہی بھینس کو چویا تھا۔ اور بیوی کو ابالنے کیلئے دیا۔ میں جانتا ہوں آپ پڑھے لکھے لوگ صرف ابلا ہوا دودھ پیتے ہیں۔ اس میں چینی بھی کافی ہے۔ یہ نیچے بیٹھی ہوئی ہے۔'' دودھ کی خوبیوں میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اس نے جمی ہوئی کریم کی ایک تہہ اس کی انگلیوں پر رکھ دی اور دوبارہ دودھ میں ڈال دی۔

''بابو جی! اسے پی لیں اس سے پہلے کہ یہ ٹھنڈا ہو۔''

نہیں نہیں۔ آپ کا شکریہ اقبال نے اپنے بچاؤ میں کہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ ان ملاقاتیوں کے دل کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس ناگوار صورت حال سے کیسے نکلے۔

''میں دودھ نہیں پیتا۔ لیکن اگر آپ ضد کر رہے ہیں تو میں اسے بعد میں پی لوں گا۔ میں ٹھنڈا پسند کرتا ہوں۔''

''ہاں۔ جیسے آپ چاہتے ہیں آپ اسے پی لیں۔ بابو جی۔'' مسلمانوں نے اس کو نجات دیتے ہوئے کہا۔ بنتا سنگھ گلاس ہی چھوڑ دو۔ بھائی اسے صبح واپس لے آئیں گے۔ نمبردار نے گلاس کو اس کے رومال سے ڈھک دیا۔ اور اسے اقبال کی چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ وہاں ایک طویل سکوت تھا۔ کریم والے دودھ کے پینے کے ناخوشگوار تصور نے اقبال کو گھیر لیا۔

اچھا۔ بابو جی۔ مسلمانوں نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ہمیں کچھ بتائیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں سب کچھ بتائیے۔

ہم اس چھوٹے گاؤں میں رہتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ نمبردار نے مداخلت کی۔ بابو جی! ہمیں بتائیے کہ انگریز کیوں چلے گئے؟ اقبال کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ ان سادہ سے سوالوں کا کیسے جواب دے۔ جیسے آزادی کے مختصر معنی ان لوگوں کیلئے کچھ نہیں۔ وہ اب تک آزادی کو محسوس نہ کر سکے تھے۔ انہیں یہ بھی بتانا تھا کہ سیاسی آزاد، معاشی

آزادی میں ہے۔ اقبال نے کہا ہم نے سینکڑوں ہزاروں جوانوں کو جنگ میں لڑنے کی ٹریننگ دی۔ اس دفعہ وہ مسلح بھی تھے۔ آپ ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کے بارے میں سن چکے ہیں؟ انگریز ڈر گئے تھے۔ ہندوستانی سپاہی جاپان کے خلاف جنگ میں انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے ان ہندوستانیوں کو مارا نہیں گیا۔ کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ سارا ملک ان کے خلاف ہو جائے گا بابو جی۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ یہ سب ٹھیک ہے۔ نمبردار نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ لیکن پچھلی جنگ میں تو ہم انگریز آفیسرز کو پسند کرتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں سے کہیں بہتر تھے۔

ہاں۔ میت سنگھ نے حمایت کرتے ہوئے کہا۔ میرا بھائی جو کہ حوالدار ہے وہ کہتا ہے کہ تمام سپاہی ہندوستانی آفیسرز کے مقابلے میں انگریز آفیسرز سے خوش ہیں۔ میرے بھائی کے کرنل کی میم صاحب لندن سے ہمیشہ میری بھتیجی کیلئے چیزیں بھیجتی ہے۔ نمبردار صاحب آپ جانتے ہیں۔ اس نے اس کی شادی پر بھی پیسہ بھیجا تھا۔ کیا ہندوستانی افسروں کی بیویاں ایسا کریں گی؟

اقبال کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

آپ لوگ آزادی کیوں نہیں چاہتے؟ کیا آپ ساری زندگی غلام رہنا چاہتے ہیں؟

ایک طویل خاموشی کے بعد نمبردار نے جواب دیا۔ آزادی ایک اچھی چیز ہے۔ لیکن کیا ہم اسے حاصل کر پائیں گے؟ پڑھے لکھے لوگ آپ کی طرح کے بابو صاحب تو انگریزوں کے جانے کے بعد ملازمتیں حاصل کر سکیں گے۔ لیکن کیا ہم بہت سی زمین اور بہت سی بھینسیں حاصل کر سکیں گے؟

نہیں۔ مسلمان نے کہا۔ آزادی ان پڑھے لکھے لوگوں کیلئے ہے جو اس کیلئے لڑ رہے ہیں۔ ہم انگریزوں کے غلام تھے اور اب ہم پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے غلام بن جائیں یا پاکستانیوں کے۔

اقبال اس کے اس تجزیے کو سن کر چونک گیا۔ آپ کے مکمل ٹھیک کہتے ہیں اس نے گرم جوشی سے تائید کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ لوگ کسان اور مزدور آزادی سے کچھ

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ متحد ہو جائیں۔ جاگیرداروں سے نجات حاصل کریں۔
آزادی کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کیلئے وہ کچھ ہو جو آپ چاہتے ہیں۔ بہت سی زمین۔
بہت سی بھینسیں۔ کوئی شک نہیں۔

اس کے ساتھی ہمیں کیا کہتے ہیں۔ میت سنگھ نے بداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ
ساتھی۔ نمبردار۔ اس کا کیا نام تھا۔ اشتراکی کیمونسٹ جیسا کچھ یا کچھ اور

کیا آپ کیمونسٹ ہیں؟ بابو صاحب۔ ایک سکھ نے پوچھا۔

نہیں۔ میں سکھ ہوں۔ وہ کیمونسٹ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ جب ان کی
جماعت کو طاقت ملی۔ وہ مندر کے اردگرد تالاب میں نالیوں کے ذریعے پانی ڈال دیں
گے۔ اور اس میں چاول اگا دیں گے۔ وہ اس کو مفید قرار دیں گے۔

یہ بیوقوفوں والی باتیں ہیں۔ اقبال نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ اس نے چاہا
کہ میت سنگھ کو اس اشتراکی کیمونسٹ کا نام یاد آ جائے۔ اس کی ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کر دینی
چاہیے اور ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے۔

اگر ہمیں خدا پر بھروسہ نہیں ہے تو ہم جانوروں کی مانند ہیں۔ مسلمانوں نے
سنجیدگی سے کہا۔ ساری دنیا مذہبی انسان کی عزت کرتی ہے۔ گاندھی کو دیکھو میں نے سنا
ہے کہ وہ اپنی وید اس اور شاسترس کے ساتھ ساتھ قرآن شریف اور انجیل بھی پڑھتے ہیں۔
زمین کے چاروں کونوں میں لوگ اس کے گن گاتے ہیں۔

میں اخبار میں گاندھی کی نماز پڑھنے کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔ بہت سے گورے
مرد اور عورتیں چارزانوں بیٹھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک گوری لڑکی نے اپنی آنکھیں بند
کی ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑے لاٹ صاحب کی بیٹی تھی۔ ستم دیکھو۔ میت سنگھ۔
انگریز بھی مذہبی انسان کی عزت کرتے ہیں۔

یقیناً چچا۔ کیا آپ اسے روپے کے سولہ آنے ٹھیک سمجھتے ہیں۔ میت سنگھ نے
اپنے پیٹ کو سہلاتے ہوئے رضامندی کا اظہار کیا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اس کا مزاج
بگڑ رہا ہے۔ یہ 420 لوگوں کی دوڑ ہے۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ان کے کہنے پر
یقین مت کرو۔

ایک دفعہ پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کا نشانہ خطا ہو چکا تھا۔ لیکن بڑے لاٹ
صاحب کی بیٹی چارزانوں آنکھیں بند کر کے اخباری فوٹو گرافرز کے فائدے کیلئے بیٹھی
ہوئی تھی۔ اور بڑا لاٹ صاحب خود بہت چالاک ہے۔

میں عیسائیوں کے ملک میں کئی سال رہ چکا ہوں۔ وہ بحیثیت انسان کے بہت
اچھے ہیں۔ لیکن سیاست میں وہ دنیا کے بہت بڑے 420 ہیں۔ اگر وہ دیانتدار ہوتے تو
ساری دنیا میں اپنا قبضہ نہ کرتے۔ اور یہ سب کچھ غیر متعلق ہے۔ اقبال نے مزید کہا۔ یہ
وہ وقت تھا کہ مضمون کو بدل دیا جاتا۔ کیا اہم ہے اور اب کیا ہونے جا رہا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ نمبردار نے کچھ جوش میں کہا۔ زمین پر تباہی و
بربادی کی ہوا چل رہی ہے۔ ہم سب صرف قتل۔ قتل کا سن رہے ہیں۔ وہ لوگ جو آزادی
کے مزے کریں گے۔ چور۔ ڈاکو اور قاتل ہیں۔ پھر اس نے دعوے سے کہا۔ ہم انگریز
کی سرپرستی میں ہی اچھے تھے۔ کم از کم تحفظ تو تھا۔

وہاں پر مکمل خاموشی تھی۔ ایک انجن اپنی لائن بدلتے ہوئے ریلوے لائن پر اپنا
بوجھ سامان والی ویگن پر ڈال رہا تھا۔ مسلمان نے موضوع بدلا۔ وہ مال گاڑی ہے۔ آج یہ
دیر سے آئی ہے۔ بابو صاحب آپ تھک گئے ہیں۔ ہم چلتے ہیں آپ آرام کریں۔ جب
بھی آپ کو ہماری ضرورت پڑے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

وہ سب اٹھ گئے ۔ اقبال نے بغیر کسی ناراضگی کے اظہار کے اپنے ملاقاتیوں
سے ہاتھ ملایا۔

اس کے بعد وہ اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔

اقبال ایک دفعہ پھر لیٹ کر ستاروں کو گھورنے لگا۔ انجن کی مسلسل آواز اسے
تنہائی اور بددلی کا احساس دلا رہی تھی۔ ایک چھوٹا آدمی چار سو ملین انسانوں کی زمین پر کیا
کر سکتا تھا۔

کیا وہ قتل روک سکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔ ہر کوئی ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ کانگریسی، لیگی
اکالی یا کیمونسٹ اس میں شامل تھے۔ یہ ایک احمقانہ تجویز تھی کہ متوسط طبقے کے انقلاب کو
ایک عوامی انقلاب مس بدل دیا جائے۔ یہ مرحلہ نہیں آیا تھا۔ ہندوستان کی سیاسی آزادی

نے عوام کو مبہم کر دیا تھا۔

اقبال کی خواہش تھی کہ وہ کسی کو منوں مجرا بھیجے۔ اس کے پاس بہت مفید پالیسی ہو گی اور ان کے ذہنوں سے سارے جال صاف کر دے گی۔ لیکن وہ ایک لیڈر نہیں تھا۔ اس کے پاس تعلیم کی کمی تھی۔ وہ بہت تیز بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا۔ اس نے کبھی قربانیاں نہیں دی تھیں۔ قدرتی بات ہے کہ کوئی اس کی بات نہیں سنے گا۔ اسے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز جیل سے کرنا چاہیے لیکن وہاں وقت نہیں تھا۔ وہ یہ سب کچھ کرے گا جیسے ہی وہ دہلی واپس جائے گا۔ تب تک یہ قتل عام بھی ختم ہو جائے گا۔ اور کافی تحفظ ہو گا۔

مال گاڑی اسٹیشن سے جا چکی تھی اور اب پل پر سے گزر رہی تھی۔ اقبال جیل کے اندر پرسکون زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے کیلئے سو گیا۔

اگلے دن صبح صبح اقبال پکڑا گیا۔ میت سنگھ اس کے پانی کا گلاس اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا اور کیکر کی لکڑی چبا رہا تھا جو کہ وہ ٹوتھ برش کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اقبال گزرنے والی ٹرین کے شور میں سو گیا تھا۔ تب ہی مؤذن اور دوسرے گاؤں والوں کی آوازیں آئیں۔ دو کانسٹیبل گردوارے میں آئے۔ اس کے کمرے کو دیکھا۔ اس کے کپ اور برج کا جائزہ لیا ایلومینیم کے چمکتے ہوئے چمچے۔ چھری کانٹے اور تھرموس کا مشاہدہ کیا۔ اور پھر چھت پر آ گئے۔ انہوں نے بدتمیزی سے اقبال کو ہلایا۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کیا کوئی پریشانی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھتا اور وضاحت سے جواب دیتا۔ وہ اس سے سوالات پوچھنا شروع ہو گئے۔ اس نے پولیس کو اپنا نام اور پیشہ بتایا۔ ایک آدمی نے چھپے ہوئے پیلے کاغذ کے خالی کالم پر کیے اور اقبال کے سامنے پلک جھپکنے میں اسے پکڑ لیا۔

یہ تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ اٹھو۔

ایک آدمی نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی کو تالہ لگا دیا۔ ہتھکڑی کے نظارے نے اقبال کو مکمل طور پر اور جگا دیا۔ اس نے بستر کی دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور پولیس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تمہیں مجھے اس طرح پکڑنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ چلایا۔

تم نے میرے سامنے وارنٹ لکھے ہیں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ تم سوئے لوگوں کو پریشان کرتے ہو۔ تمہیں اس غلطی کی معافی مانگنی ہو گی اقبال نے انتظار کیا کہ پولیس والے کچھ کہیں تا کہ وہ قانون اور ضابطے کے خلاف اپنی پرجوش تقریر کے ساتھ جا سکے لیکن انہوں نے اسے قابو میں رکھا۔

''تم تھوڑا انتظار کرو گے۔۔ میں ہاتھ منہ دھولوں اور کپڑے بدل لوں اور اپنی چیزوں کو حفاظت کی خاطر کسی کے پاس چھوڑ جاؤں۔'' اقبال نے جارحانہ انداز میں کہا۔

ان کو دوسرا موقع دیا کہ وہ کچھ کہیں

ٹھیک ہے۔ بابو صاحب۔ جہاں تک تم جانا چاہتے ہو۔ جاؤ پولیس والوں کے عوامی رویئے نے اقبال کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور سیڑھیوں سے نیچے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کنوئیں کے پاس گیا اور ایک بالٹی پانی سے بھر کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگا۔ وہ جلدی میں نہیں تھا۔

پولیس کے حکمرانی کے دن ختم ہو رہے ہیں۔ اگر تم میں ہمت ہے تو اپنے ہاتھ مجھ پر رکھو ساری دنیا اس کے بارے میں سنے گی۔ میں دیکھ لوگوں گا اور یہ کاغذ لوگوں کو بتائیں گے کہ تم اپنی ذمے داری ادا کرنے میں کتنے بھلے مانس ہو۔

پولیس والے اقبال کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کا ربڑ کا تکیہ اس کی چٹائی اور سب چیزیں جو انہوں نے اس کے کمرے میں دیکھی تھیں۔ وہ بھی ساتھ لے گئے۔ اقبال کا جارحیت پسندانہ رویہ پولیس والوں کو بے چین کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید انہوں نے اسے پکڑ کر غلطی کی ہے۔

''بابو صاحب! ہم نے صرف اپنی ڈیوٹی انجام دی ہے۔'' ایک سپاہی نے کہا۔ تم مجسٹریٹ سے سب معاملات طے کر لو۔ دوسرے نے ہمدردی دکھائی۔ وہ اقبال کو ہتھکڑی میں جکڑا دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

''میں تم سب سے نبٹ لوں گا۔'' اقبال نے کہا۔

بھائی میت سنگھ چاق و چوبند کیکر کی شاخ کے پچھلے حصے سے برش کرتے ہوئے

واپس آئے جو کہ اس نے چبا چبا کر ریشے دار برش میں بدل دی تھی۔ گردوارے میں پولیس کی موجودگی نے اسے بالکل حیران نہیں کیا۔ جب وہ گاؤں میں آئے اور نمبردار کے گھر ان کی کوئی مہمان نوازی نہیں ہوئی تو وہ گردوارے آ گئے۔ وہ زمیندار کے قتل کے بعد ان کے آنے کی امید کر رہے تھے۔

ست سری کال۔ میت سنگھ نے کیکر کے برش کو پھینکتے ہوئے کہا۔ ست سری کال۔ پولیس والوں نے جواب دیا۔

آپ کوئی چائے پانی وغیرہ پینا پسند کریں گے؟ مکھن والا دودھ؟

ہم بابو صاحب! کا انتظار کر رہے ہیں۔ پولیس والوں نے کہا اگر تم ہمیں کچھ دے سکتے ہو تو جب وہ تیار ہو جائیں تو' دینا بڑی مہربانی ہو گی۔

میت سنگھ نے اپنی بے رخی کو یونہی قائم رکھا۔ یہ اس کیلئے کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ پولیس والوں سے بحث کرتا یا ان کے کاروبار کے بارے میں پوچھتا۔ اقبال سنگھ کیمونسٹ پارٹی کا رفیق بن چکا تھا۔ وہ یقیناً ان ہی کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کیلئے بھی چائے بناؤں گا۔ میت سنگھ نے جواب دیا۔ اس نے اقبال کی طرف دیکھا۔ تم اپنی بڑی بوتل میں ڈالواؤں گے؟

تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اقبال نے اپنے ٹوتھ پیسٹ سے بھرے منہ سے کہا۔ اس نے اسے باہر تھوک دیا۔ بوتل میں چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ میں ایک گرم کپ کیلئے بہت شکر گزار ہوں گا۔ اور اگر آپ برا نہ مانیں تو میرے جانے کے بعد میری چیزوں کا خیال رکھئے گا۔ یہ مجھے کس وجہ سے گرفتار کر رہے ہیں۔ انہیں خود بھی نہیں معلوم۔

میت سنگھ نے ظاہر کیا کہ جیسے وہ سن نہیں رہا تھا۔ پولیس والے تھوڑے بے وقوف نظر آ رہے تھے۔

''اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں۔ بابو صاحب! ان میں سے ایک نے کہا۔ آپ ہم سے کیوں ناراض ہو رہے ہیں۔ مجسٹریٹ کو جا کے غصہ دکھائیں۔

اقبال نے اپنے دانتوں میں برش کرتے ہوئے اس کی باتوں کو نظرانداز کر دیا۔ اس نے اپنا منہ دھویا اور تولیے سے رگڑتا ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے گدے اور

تکیے میں سے ہوا نکالی اور ایک دوسرے میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد اپنے بستر بند میں کتابیں، کپڑے۔ ٹارچ اور ایک بڑا سلور تھرموس رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اس نے اپنی چیزوں کی ایک فہرست بنائی اور انہیں واپس رکھ دیا۔ جب میت سنگھ چائے لیکر آیا اقبال نے وہ بستر بند اسے تھما دیا۔

''میں نے اس بستر بند میں اپنی سب چیزیں رکھ دی ہیں۔ مجھے امید ہے اس کی دیکھ بھال میں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اپنے آزاد ملک کی پولیس کے مقابلے میں میں آپ پر بھروسہ کروں گا'' پولیس والے باہر دیکھنے لگے میت سنگھ پریشان تھا۔

یقیناً بابو صاحب! اس نے عاجزی سے کہا۔ میں آپ کا نوکر ہوں جیسے ان پولیس والوں کا۔ یہاں سب آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ آپ اپنے کپ میں چائے پسند کریں گے؟

اقبال نے اپنے پلاسٹک کے چائے کا کپ اور چمچہ نکالا۔ کانسٹیبل نے میت سنگھ سے گلاس پکڑ لئے۔ انہوں نے گرم گلاس کو اپنی پگڑی کے آخری حصے سے پکڑ لیا تاکہ گرم گلاس سے اپنے ہاتھوں کو جلنے سے بچا سکیں۔

ہر قسم کے اندیشوں سے بچنے کیلئے انہوں نے آواز سے چسکی لینی شروع کر دی۔ لیکن اقبال اس صورت حال پر مکمل حاوی تھا۔ اقبال رسی کے کھٹولے پر بیٹھا تھا جبکہ وہ دہلیز پر بیٹھے تھے اور میت سنگھ باہر فرش پر بیٹھا تھا۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ (اقبال) اس کے ساتھ بدتمیزی سے بات کر سکیں۔

کانسٹیبل نے ہتھکڑی بیلٹ سے نکال کر اس کی جیب میں ڈال دی۔ انہوں نے اپنی چائے ختم کی اور جانے کے لئے بے چین نظر آنے لگے۔ اقبال اس الزام کے بعد ان کے سر پر اکڑ کر بیزار بیٹھا ہوا تھا۔ اقبال چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خلا میں گھورنے لگا۔

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنے ہاتھوں کو باندھ کر اعلان کیا کہ میں تیار ہوں۔ اور اپنے ہاتھ ہتھکڑی پر رکھ دیئے۔

ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔ بابو جی! ہتھکڑی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنا

منہ چھپانا چاہتے ہو تو چھپا لو۔ تاکہ شرمندگی نہ ہو۔ ایک سپاہی بولا۔ اقبال نے اس کی بات سن کر غصے سے کہا کیا تم اس طرح اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہو؟ اگر قانون ہے تو مجھے بھی ہتھکڑی لگنی چاہیے تم مجھے بھی ہتھکڑی لگاؤ۔ میں اپنے پہچانے جانے سے بالکل نہیں ڈرتا۔ میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ میں ایک سیاسی کارکن ہوں۔ میں گاؤں سے اسی طرح جاؤں گا تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ پولیس لوگوں کے ساتھ کیا ظلم کر رہی ہے۔

اقبال کی یہ بات ایک کانسٹیبل کی برداشت سے باہر تھی۔ آج تک کسی نے اس لہجہ میں بات نہیں کی تھی۔

بابو جی۔ ہم آپ سے مہذب انداز میں پیش آ رہے ہیں۔ ہم آپ کو ہر دفعہ جی جی کہہ رہے ہیں لیکن آپ ہمارے سر پر بیٹھنا چاہتے ہیں ہم آپ کو سو دفعہ کہہ چکے ہیں کہ ہم اپنی ذمے داری پوری کر رہے ہیں۔ لیکن آپ یہ یقین دلانے کی کوشش میں ہیں کہ ہماری کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ اس کو ہتھکڑی ڈال دو۔ اگر یہ اپنے چہرے کو چھپانا چاہتا ہے تو چھپا لے۔ اس کی مرضی۔

ہم رپورٹ دے دیں گے کہ اس نے خود چہرہ چھپانے سے معذرت کی۔

اقبال اس طرح کا طنزیہ جواب سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی طوطے جیسی ناک کی وجہ سے کافی شرمندگی کا احساس تھا۔ نادانستہ اس نے اپنے ہاتھ کے پچھلے حصے سے اسے رگڑا۔ ظاہری جسمانی بناوٹ کے حوالے سے وہ ہمیشہ اسے پیچھے رکھتی تھی۔ ہتھکڑیاں اس کی کلائیوں کے گرد باندھ دی گئیں اور اس کی زنجیر پولیس والے نے اپنی بیلٹ سے باندھ لی۔

''ست سری کال۔ بھائی جی۔ میں جلدی واپس آؤں گا۔''

ست سری کال۔ اقبال سنگھ جی اور گرو آپ کی حفاظت کریں۔

ست سری کال۔ سنتری جی۔

ست سری کال۔

پولیس پارٹی گردوارے کے صحن سے میت سنگھ کو چائے کی کیتلی ہاتھ میں پکڑے کھڑا چھوڑ کر چلی گئی۔

جس وقت دو کانسٹیبل اقبال کو پکڑنے کیلئے بھیجے گئے تھے۔ اسی وقت دس آدمیوں کا ایک با اختیار دستہ جگت سنگھ کو پکڑنے کیلئے بھی بھیجا گیا۔

پولیس کے آدمیوں نے اس کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بعض مسلح کانسٹیبل رائفل کے ساتھ ہمسائیوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ جبکہ کچھ سامنے اور اور کچھ گھر کے عقب میں کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت چھ اور مسلح افراد ریوالور کے ساتھ تیزی سے صحن میں داخل ہوئے۔ جگت سنگھ حالات سے بے خبر اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک گندی سی سفید چادر سر سے پاؤں تک لپیٹی ہوئی تھی اور زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے دو راتیں اور ایک دن جنگل میں بغیر کچھ کھائے پیئے گزارا تھا۔ وہ صبح سویرے اس وقت اپنے گھر آیا جب اسے یقین ہو گیا کہ گاؤں میں سب لوگ سو رہے ہوں گے۔ جگت سنگھ کے ہمسائے بہت ہوشیار تھے انہوں نے پہلے بھی فوراً پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔

جگت سنگھ کی ماں دروازے کو باہر سے چٹخنی لگا کر کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ جگت سنگھ کے سوتے میں ہی اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور دائیں کلائی میں ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پولیس والوں نے اپنے ریوالور واپس اپنی بیلٹ میں لگا لئے۔ باقی لوگ بھی اپنی رائفلوں کے ساتھ صحن میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے بندوق کے بٹ کا آخری حصہ جگت سنگھ کو چبھویا۔

''اوہ جگا۔ اٹھ جا۔ دن نکل آیا ہے۔''

دیکھ کیسے خنزیر کی طرح سو رہا ہے۔ جیسے اسے دنیا کی کوئی پرواہ نہیں۔ جگا گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ہتھکڑی اور بیڑی کو گھور کر دیکھا۔ تب اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور جمائی لی۔

نیند اس پر پھر سے غالب ہو گئی اور وہ اونگھنے لگا۔ اتنے میں جگت سنگھ کی ماں بھی واپس آ گئی اس نے حیرانی سے اپنے صحن میں موجود مسلح پولیس والوں کو دیکھا۔ اس کا بیٹا اپنے سر کو ہتھکڑی لگے ہاتھوں پر رکھے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اس کی طرف دوڑی ہوئی آئی اور اس کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر جگت سنگھ کی گود میں رکھ دیا اور چیخنے لگی۔ جگت سنگھ اپنے خیالوں سے جاگ گیا۔ اس نے غصے میں دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کو پیچھے دھکیلا۔

تم کیوں چیخ رہی ہو ماں؟ تم جانتی ہو کہ میں نے ان ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ، کچھ نہیں کیا۔

جگت سنگھ نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کے واسطے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں اس نے کچھ نہیں کیا۔ جگت سنگھ کی ماں نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

تو پھر قتل کی رات یہ کہاں تھا؟ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ وہ باہر اپنے کھیتوں میں گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں وہ نہیں تھا۔

یہ ایک بدمعاش ہے اور قانون کے مطابق سورج غروب ہونے کے بعد وہ گاؤں سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس وجہ سے ہم اس کو کسی بھی کیس میں گرفتار کر سکتے ہیں۔ اس نے اشارہ کر کے اپنے آدمیوں سے کہا۔ کمرے اور باڑے کی تلاشی لو۔

ہیڈ کانسٹیبل کو جگت سنگھ پر شک تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے میں حصہ نہیں لے سکتا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔

چار کانسٹیبل گھر کی تلاشی میں لگ گئے۔ خالی اسٹیل کے ٹرنک اور ٹین کے ڈبوں کو ٹٹولنے لگے۔ سوکھی گھاس کا ڈھیر نیچے گر گیا اور سوکھی گھاس صحن میں پھیل گئی۔ برچھی بغیر کسی دشواری کے مل گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ یہاں تمہارے چچا نے رکھی ہے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بلیڈ ایک کپڑے کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے اس پر خون کے دھبے ہوں۔

''اس پر کچھ نہیں ہے۔ ماں چلائی۔ کچھ نہیں یہ اس نے جنگلی سور کو مارنے کیلئے رکھا ہے جو کہ فصلوں کو تباہ کرنے آتے ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ جگت سنگھ بے قصور ہے۔''

ہم دیکھ لیں گے۔ ہم دیکھ لیں گے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے جگت سنگھ کی بوڑھی ماں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ تم اس کی بے گناہی کا ثبوت مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی تیاری کرو۔

جگت سنگھ کی ماں نے سسکیاں لینا بند کر دیں۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کے پاس ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا وہ ثبوت ہے جو ڈاکو جاتے ہوئے بڑھکیں مار کر اس کے گھر پھینک

گئے تھے۔۔ لیکن اس نے جگا کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اگر وہ بتا دیتی تو یقیناً جگا اس بے عزتی کا بدلہ لینے جاتا اور کسی کو جوش میں مار دیتا۔ اب وہ ہتھکڑی اور بیڑیوں میں تھا۔ صرف غصہ کر سکتا ہے۔

انتظار کرو پولیس والوں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔ سپاہیوں نے اسے اندر جاتے دیکھا۔ چند لمحوں میں وہ اپنے اسٹیل کے ٹرنک کے اوپر سے ایک پیکٹ نکال کر لائی۔ اس کے پاس بھورے رنگ کا بغیر لپٹا ہوا کاغذ تھا۔ اس میں نیلی اور لال ٹوٹی ہوئی چوڑیاں تھیں۔ ان میں سے دو ثابت تھیں۔ کانسٹیبل نے انہیں لے لیا۔ یہ کس قسم کا ثبوت ہے؟

ڈاکوؤں نے قتل کے بعد یہ صحن میں پھینکی تھیں وہ جگا کی بے عزتی کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ دیکھو! اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔ میں بہت بوڑھی ہوں شیشے کی چوڑیاں نہیں پہنتی اور وہ میری کلائی کے حساب سے بہت چھوٹی ہیں۔

تب تو جگا جانتا ہوگا کہ وہ ڈاکو کون تھے۔ جب انہوں نے یہ چوڑیاں پھینکی تو وہ کیا کہہ رہے تھے؟ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ جگا کو گالیاں دے رہے تھے۔

کیا تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتیں۔ جگا نے غصے سے مداخلت کرتے ہوئے کہا میں نہیں جانتا کہ وہ ڈاکو کون تھے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔

تمہیں چوڑیاں کون دے سکتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے شیشے کے ٹکڑے ہاتھ میں لئے اور مسکرایا۔ جگا کو غصہ آ گیا۔

اس نے اپنا ہتھکڑی والا ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور تیزی سے نیچے لاتا ہوا کانسٹیبل کے سر پر مار دیا۔ کانسٹیبل نے بھی جواب میں تھپڑوں اور جوتوں کی بارش کر دی۔ اور ٹھڈے مارے۔ وہ اپنے کولھوں پر بیٹھ گیا اور اپنے بازوؤں سے اپنے سر کو بچانے لگا۔ اس کی ماں نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا اور دوبارہ سے چیخنے لگی۔ ممتا نے جوش مارا اس نے پولیس کے گھیرے کو توڑا اور اپنے آپ کو اپنے بیٹے پر گرا دیا۔

اسے مت ماروں گرو تمہیں اس کی سزا دیں گے۔ یہ بے قصور ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے۔تم مجھے مار سکتے ہو۔

پولیس والوں نے مارنا بند کر دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی ہتھیلی میں سے شیشے کے ٹکڑے لے لئے۔ اس کے رومال سے صاف کر دیا۔

تم اپنے بیٹے کی بے گناہی کے ثبوت سنبھال کے رکھو۔ اس نے تلخی سے کہا۔ ہم اس کتیا کے بچے کی کہانی اپنے طریقے سے لکھیں گے۔

جب اس کے جسم پر چابک پڑے گا۔ تو یہ بولے گا۔ باہر لے جاؤ اسے۔ جگت سنگھ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ اپنی ماں کو بغیر کوئی اور جذباتی منظر دکھائے چلا گیا اس کی ماں مسلسل آہ وزاری کر رہی تھی اور اپنے ماتھے اور سینے کو پیٹ رہی تھی۔

میں جلدی واپس آؤں گا۔ وہ مجھے اس تھپڑ مارنے کی زیادہ سزا نہیں دلوا سکتے سوائے چند مہینوں کی قید کے۔

جگت سنگھ نے اپنے غصے پر اتنی ہی جلدی قابو پا لیا۔ جتنی جلدی وہ بگڑا تھا۔ وہ چوڑیوں والا حادثہ بھی بھول گیا اور مار پیٹ کا بھی جیسے جیسے وہ اپنے گھر کی دہلیز سے دور ہوتا گیا۔ اس کے دل میں پولیس کیلئے کوئی بغض یا بری خواہش نہ تھی۔ وہ دوسرے انسانوں کی طرح کے انسان تھے۔ ان میں کوئی ردعمل۔ کوئی وفاداری یا کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ صرف یونیفارم پہنے ہوئے آدمی تھے۔

جگت سنگھ اپنا منہ نہیں چھپانا چاہتا تھا۔ پورا گاؤں اسے جانتا تھا۔ وہ گاؤں والوں کے پاس سے گزرا تو مسکرایا اور ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو اٹھا کر ہر ایک سے خوشی کا اظہار کیا۔ بیڑی لگے پاؤں اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ آہستہ آہستہ چلے۔ اس نے اپنی لاپرواہی کا اظہار اپنی بھوری مونچھوں کو مروڑ کر اور پولیس والوں کو ناشائستہ لطیفے سنا کر کیا۔

اقبال اور دو کانسٹیبل جگت سنگھ کی پارٹی کے ساتھ دریا پر آ کر مل گئے۔ وہ سب ندی کے اوپر سے دریا کی طرف جا رہے تھے۔ سب سے آگے ہیڈ کانسٹیبل چل رہا تھا۔ مسلح سپاہی اطراف میں چل رہے تھے۔ اور کسان ان کے پیچھے چل رہے تھے۔

اقبال ان کی سرخ اور خاکی وردی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جگت سنگھ کا سر اور

کندھے سپاہیوں کی پگڑی پر سے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ایک محاورے کی مانند لگ رہا تھا کہ بہت سے گھوڑے ایک ہاتھی کے ساتھ ان کے درمیان میں لمبا چوڑا دھیمی چال والا اپنی زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ ایسے جا رہا تھا جیسے گھوڑا اپنے آرائشی سازو سامان کے ساتھ جاتا ہے۔

کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ پولیس والے پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے ایک غلطی کی ہے یا پھر دو غلطیاں کی ہیں۔ سوشل ورکر کو پکڑنا حماقت تھی اور پریشانیوں کو بلانے کا باعث بھی۔ اس کا شریک جنگ جیسا رویہ اس کی بے گناہی کا ثبوت تھا۔ اس کے خلاف کسی قسم کا کیس بنانا پڑے گا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کچھ کر کے ہمیشہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جگت سنگھ بھی ان صحیح لوگوں میں سے ایک ستم رسیدہ تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر رات کے وقت گاؤں سے باہر جا کر قانون توڑا تھا۔ لیکن اس نے اس ڈاکے میں شامل ہونا پسند نہیں کیا جو کہ اس کے اپنے گاؤں میں ڈالا گیا۔ وہ اپنے لمبے قد کی وجہ سے آسانی پہچانا جائے گا۔ یہ صاف واضح ہو گیا تھا کہ یہ دونوں پہلی دفعہ ملے تھے۔

اقبال کا سارا فخر مٹی میں مل چکا تھا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ جگت سنگھ سے ملا۔ جو اس کے بارے میں یہ تاثر رکھتا تھا کہ اقبال اپنی سیاست کی وجہ سے گرفتار ہوا ہے۔ اس نے ہتھکڑی لگانے کی ضد کی تھی تاکہ گاؤں والے دیکھ سکیں کہ کیا شان وشوکت سے وہ سب کچھ اپنے اوپر برداشت کر رہا ہے۔

وہ اس طرح سے ایک شہری کی آزادی کو سلب کرنے کی شرمناک حرکت پر احتجاج کریں گے۔ لیکن وہ لوگ بے وقوفوں کی طرح منہ پھاڑ کر جمائی لے رہے تھے اور عورتیں اپنے برقعوں میں سے اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے پوچھ رہی تھیں۔ یہ کون ہے؟

جب وہ جگت سنگھ کے حفاظتی دستے کے گروپ میں شامل ہوا تو پولیس والوں کی یہی نصیحت تھی۔ اپنا منہ چھپاؤ ورنہ تم شناختی پریڈ میں پہچانے جاؤ گے۔ وہ رام لال کے قتل کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ یہ بہت بے وقوفی تھی۔ وہ اس پر مشکل ہی سے یقین کر سکتا

تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ قتل کے بعد سنوں مجرا آیا تھا۔ اسی ٹرین پر جس میں پولیس آئی
تھی۔ درحقیقت وہ قتل کے موقع پر اس کی غیر موجودگی کے گواہ ہو سکتے تھے۔ صورت حال
بہت مضحکہ خیز بن گئی تھی۔

لیکن پولیس والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کریں وہ کسی بھی
قسم کا جھوٹا الزام لگا دیں گے۔ آوارہ اور روڑے اٹکانے والے افسر اپنی ڈیوٹی انجام دیں
گے۔ یا کچھ ایسا ہی۔ وہ ان سے ڈٹ کر لڑے گا۔

اس پارٹی میں صرف جگت سنگھ ہی ایسا تھا جو کہ پریشان نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی
گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے اتنا ہی وقت جیل میں گزارا تھا جتنا کہ اپنے گھر میں۔ پولیس
سے اس کا تعلق وراثتی تھا۔

پولیس اسٹیشن کے رجسٹر میں نمبر دس جو کہ علاقے کے بدنام لوگوں کی حرکات و
سکنات کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اس کے باپ الم سنگھ کا نام بھی اسی سے پکارا جاتا تھا جب وہ
زندہ تھا۔ الم سنگھ کو عدالت کی طرف سے ڈاکے اور قتل کرنے کی سزا دی گئی اور پھانسی پر لٹکا
دیا گیا۔ جگت سنگھ کی ماں نے اپنی ساری زمین گروی رکھ کر وکیلوں کی فیسیں دیں۔ جگت
سنگھ کو زمین چھڑوانے کیلئے پیسے درکار تھے اور اس نے یہ سب کچھ ایک سال میں کر دیا۔
کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ پیسے کہاں سے اگا رہا ہے لیکن سال کے آخر میں
پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔

اس کا نام رجسٹر کے نمبر دس میں لکھا گیا۔ اور وہ سرکاری طور پر ایک برا آدمی
قرار دے دیا گیا۔ اس کے پیٹھ پیچھے سب اسے دس نمبری کہہ کر پکارتے تھے۔

جگت سنگھ نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے قیدی کو کئی بار دیکھا۔ وہ اس سے باتیں
کرنا چاہتا تھا۔ اقبال نے اپنی آنکھیں اپنے سے آگے گاڑھی ہوئی تھیں ایک اداکار کی
طرح چل رہا تھا جو کیمرے کا خیال رکھتے ہوئے لینز کا سامنا کرتے ہیں۔

جگت سنگھ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

سنو۔ تم کس گاؤں کے ہو؟ اس نے پوچھا اور دانت پیسنے شروع کر دیے۔

اقبال نے اوپر کی طرف دیکھا لیکن مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں گاؤں

کا نہیں ہوں۔ میں دہلی سے آیا ہوں۔ میں کاشتکاروں کو منظم کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن
حکومت نہیں چاہتی کہ لوگ منظم ہوں۔

جگت سنگھ بڑا مہذب بن گیا۔ اس نے شناسائی جیسا لہجہ بنایا۔ میں نے سنا ہے
اب ہمارا اپنا قانون ہے۔ دہلی میں مہاتما گاندھی کی حکومت ہے۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟
وہ کہتے ہیں ایسا ہی ہمارے گاؤں میں ہے۔

ہاں۔ انگریز جا چکے ہیں لیکن انڈیا کے رئیسوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ تم
اور تمہارے گاؤں کے ساتھی آزادی کا کیا مطلب لیتے ہیں؟ بہت سی روٹی اور بہت سے
کپڑے؟

تم اف بھی نہیں کرتے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہو جو انگریزوں
نے تمہیں پہنائی تھیں۔ ہمیں متحد ہونا چاہیے اور اٹھنا چاہیے۔ ہمارے پاس کھونے کیلئے کچھ
نہیں ہے سوائے ان زنجیروں کے۔ اقبال نے اپنے ہاتھ اس کے چہرے سے اوپر اٹھا کر
اپنے اس آخری جملے کو تاکید سے کہا اور ان کو جھٹکے دیئے جیسے کہ اس طرح کی حرکات
ہتھکڑیاں توڑ دیں گی۔

پولیس والوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جگت سنگھ نے اپنے ٹخنے کے
گرد لگی بیڑی کی طرف نیچے دیکھا اور لوہے کی زنجیر کی طرف جو کہ ان کو ہتھکڑی سے جوڑ
رہی تھی۔

میں بدمعاش ہوں۔ ہر حکومت مجھے جیل میں ڈالتی ہے۔ لیکن۔ اقبال نے غصے
سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں بدمعاش کس نے بنایا ہے؟ حکومت نے!

یہ قانون بناتی ہے اور رجسٹر کرتی ہے۔ پولیس والے اور جیلرز اس کو نافذ کرتے
ہیں۔ کسی کیلئے بھی وہ پسند نہیں کرتے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے چاہے وہ اسے برا
آدمی یا مجرم بھی کیوں نہ بنا دے۔ میں نے کیا کیا؟

نہیں۔ بابو صاحب۔ جگت سنگھ نے دلچسپ انداز میں بات کاٹتے ہوئے کہا یہ
ہماری قسمت ہے۔ یہ ہمارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔ اور ہمارے ہاتھ کی لکیروں پر۔

میں ہمیشہ کچھ کرنا چاہتا ہوں جب کھیتی باڑی کر چکا ہوتا یا جب کٹی ہوئی فصل

اکٹھی ہو چکی ہوتی تب تو میں مصروف ہوتا ہوں۔ لیکن جب کرنے کیلئے کوئی کام نہیں ہوتا تو میرے ہاتھوں میں کچھ کرنے کیلئے مسلسل کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ بس میں کچھ کر دیتا ہوں اور یہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔

پارٹی پل کے نیچے سے گزر رہی تھی اور ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچنے والی تھی۔

جگت سنگھ اقبال سے مطمئن تھا۔ وہ اپنے دلائل ایک گاؤں کے برے آدمی کے ساتھ بحث میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے الفاظ مجسٹریٹ کیلئے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے انگلش میں بات کرے گا۔ اور اس کا انداز اسے پریشان کر دے گا۔ جب پولیس قیدیوں کو لیکر آئی تو سب انسپکٹر نے حکم دیا کہ انہیں نوکروں کے کواٹر میں لے جایا جائے۔ مجسٹریٹ اپنے ڈریسنگ روم میں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دونوں قیدیوں کو اپنے آدمی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور بنگلے میں واپس آ گیا۔

یہ بھلا مانس چھوٹا آدمی کون ہے؟ سب انسپکٹر نے پوچھا۔ جو کہ تھوڑا پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے آپ کے حکم پر گرفتار کیا ہے۔ یہ وہی عجیب آدمی ہے جو کہ سکھوں کے گردوارے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

اس جواب نے سب انسپکٹر کو غصہ دلا دیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا اپنا کوئی دماغ نہیں ہے۔ میں نے تمہیں چھوٹا سا کام کرنے کو کہا تھا تم گئے اور اپنے آپ کو بے وقوف بنا دیا۔ تمہیں اسے گرفتار کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیے تھا۔

کیا یہ وہی آدمی نہیں ہے جو اس دن پرسوں ہمارے ساتھ ٹرین سے اترا تھا۔

ٹرین؟ ہیڈ کانسٹیبل نے بات جاری رکھتے ہوئے بناوٹی انداز میں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ٹرین پر نہیں دیکھا۔ میں نے صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اور میں گاؤں میں آوارہ گردی کرنے والے اس عجیب آدمی کو گرفتار کر لیا۔

سب انسپکٹر کا پارہ ایک دم آسمان کو پہنچ گیا۔

گدھا!

ہیڈ کانسٹیبل اپنے افسر کی گھورتی آنکھوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم کس علاقے کے گدھے ہو۔ اس نے سختی سے دوبارہ دہرایا۔ تمہارے پاس ذرا عقل نہیں ہے۔

غریبوں کے مائی باپ۔ میرے سے کیا غلطی ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ بکواس بند کرو۔ انسپکٹر پھر چیخا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ انسپکٹر نے اپنا غصہ کم کیا۔ اس نے مجسٹریٹ حکم چند کا سامنا کرنا تھا اور اس سے امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ معاف کر دے گا۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ بغور دیکھتا ہوا لوہے کی جالی کے دروازے کی طرف چل دیا۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

اندر آ جائیں۔ اندر آ جائیں۔ انسپکٹر صاحب۔ مجسٹریٹ حکم چند نے جواب دیا۔ ان تکلفات میں نہ پڑا کریں۔ سب انسپکٹر اندر چلا گیا اور سیلوٹ کیا۔ حکم چند اپنی تازہ شیو کی ہوئی تھوڑی پر کریم لگا رہا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر ایک گلاس کے اوپری حصے میں سفید گولی گھوم رہی تھی۔ اور بھاپ کے غبارے بنا رہی تھی۔

سر۔ ہم نے آج صبح دو قیدی پکڑے ہیں۔ ایک جگا بدمعاش ہے وہ ڈاکے کی رات اپنے گھر سے غائب تھا۔ ہم اس کے باہر جانے سے متعلق معلومات اکٹھی کر رہے ہیں۔ دوسرا وہ عجیب شخص ہے جس کی موجودگی کے بارے میں ہیڈ کانسٹیبل نے رپورٹ کی تھی اور آپ نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔

حکم چند نے اپنی تھوڑی کی مالش بند کر دی۔ وہ اس دوسرے آدمی کی گرفتاری کے بارے میں پتہ لگانا چاہتا تھا۔ جس کا حکم اس کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ وہ کون ہے؟

سب انسپکٹر نے چلا کر باہر کھڑے ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔ جس کو تم سکھ گوردوارے سے گرفتار کر کے لائے ہو۔ اس کا نام کیا ہے؟

اقبال۔

اقبال کیا؟ مجسٹریٹ نے اونچی آواز میں سوال کیا۔

میں ابھی پتہ لگا کر آتا ہو۔ سر۔ ہیڈ کانسٹیبل بھاگتا ہوا نوکروں کے کوارٹر کی طرف گیا اس سے پہلے کہ مجسٹریٹ اس کے پاس آتا حکم چند کو محسوس ہوا کہ جیسے اسے

بہت غصہ آ رہا ہے۔ اس نے گلاس سے ایک گھونٹ پانی۔ سب انسپکٹر بے چینی سے پاؤں رگڑ رہا تھا۔ کچھ منٹ بعد ہی ہیڈ کانسٹیبل واپس آ گیا اور کھانس کر اپنے واپس آنے کا اعلان کیا۔

سر۔ وہ دوبارہ کھانسا۔ سر۔ وہ لکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ مجسٹریٹ غصے میں دروازے کی طرف مڑا۔

کیا اس کے ماں اور باپ ہیں۔ کوئی مذہب ہے یا نہیں؟ تعلیم یافتہ!

سر۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے باپ کا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ آپ سے خود بات کرے گا۔

جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ مجسٹریٹ نے گرج کر کہا۔

حکم چند بہت غصے میں تھا۔ اس نے گلاس میں موجود باقی پانی ایک گھونٹ میں پی لیا۔ اور تولیے سے اپنا سر رگڑنے لگا۔ تم اور تمہارے پولیس والے اچھے ہیں۔ تم جاتے ہو اور لوگوں کو ان کا نام ان کی اصل ولدیت یا مذہب جانے بغیر گرفتار کر لیتے ہو۔ کسی دن تم گورنر کو گرفتار کر لینا اور کہہ دینا حکم چند نے تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ تم مجھے معطل کراؤ گے۔

سر میں خود۔ اس سارے معاملے کو دیکھوں گا۔ یہ آدمی پرسوں منوں مجرا آیا۔ میں اس کے حالات اور کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔

اچھا تم تو جاؤ۔ اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھنا جب تک یہ کام کر نہ لو۔ حکم چند نے چیخ کر کہا۔ جلدی غصے میں آنا اور مفرور ہونا اس کی عادت نہیں تھی۔

سب انسپکٹر کے جانے کے بعد اس نے آئینے میں اپنی زبان کو دیکھا اور گلاس میں ایک اور گولی ڈال دی۔

سب انسپکٹر باہر چلا گیا اور برآمدہ میں رک کر اس نے ٹھنڈی سانسیں لیں۔ مجسٹریٹ کے غصے نے اسے اپنا رویہ بدلنے میں مدد دی۔

اقبال اور اس کا حفاظتی دستہ جگت سنگھ کے ساتھ کھڑا تھا۔ نوجوان اقبال بڑی

شان و شوکت والا لگ رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے سوچا۔ یہ اس سے بات کرنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ اس آدمی کے کپڑوں کی تلاشی لو۔ کواٹروں میں کہیں اندر لے جاؤ اور اس کے کپڑے اتاروں میں اس کی خود تلاشی لوں گا۔

اقبال اپنی سوچی ہوئی تقریر اب تک نہیں کر سکا تھا۔ کانسٹیبل اسے ہتھکڑی سمیت کمرے میں لے گیا۔ وہاں کے رہائشی جا چکے تھے۔ اس نے اپنی قمیض اتاری اور پولیس والے کو پکڑا دی۔ سب انسپکٹر اندر آیا اور بغیر کسی زحمت کے اس کی قمیض کی تلاشی لینے لگا۔

اپنا پاجامہ اتارو!

اقبال نے ذلت محسوس کی۔ اب اس میں لڑنے کی شکتی نہیں بچی تھی۔ پاجامے میں کوئی جیب نہیں ہے۔ میں ان میں کچھ نہیں چھپا سکتا۔

اسے اتارو اور بحث مت کرو۔ سب انسپکٹر نے اکڑ کر اپنی چھڑی سے اس کا پاجامہ اتار کر حکم کی تعمیل کروائی۔

اقبال نے اپنی ڈوری کی گرہ کو ڈھیلا کیا۔ پاجامہ اتر کر اس کے ٹخنوں میں گر گیا۔ اس نے اپنی عریانی کلائی میں لگی ہتھکڑیوں سے چھپائی۔ اس نے اپنا پاجامہ اتار کر پولیس کو چیک کرنے کیلئے دیا۔

نہیں۔ یہ ضروری نہیں۔ میں جو دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھ چکا ہوں تم اپنے کپڑے پہن لو۔ تم کہتے ہو کہ تم ایک سوشل ورکر ہوں۔ تمہارا منوں مجرا میں کیا کاروبار ہے؟ انسپکٹر نے پوچھا۔

مجھے میری پارٹی نے بھیجا تھا۔ اقبال نے اپنے پاجامے کی ڈوری کی گرہ کو باندھتے ہوئے کہا۔

کونسی پارٹی؟

پیپلز پارٹی آف انڈیا۔

سب انسپکٹر نے برا سا منہ بنا کر مسکراتے ہوئے اقبال کی طرف دیکھا۔

پیپلز پارٹی آف انڈیا۔ اس نے آہستہ سے دوبارہ کہا تمہیں یقین ہے کہ وہ مسلم

لیگ نہیں تھی؟

اقبال اس سوال کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا۔

نہیں۔ مجھے مسلم لیگ کا ممبر کیوں ہونا چاہیے تھا؟ اقبال کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سب انسپکٹر کمرے سے چلا گیا۔ اس نے کانسٹیبل کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے۔ وہ مجسٹریٹ کو اپنی تفتیش کی رپورٹ دینے کیلئے واپس ریسٹ ہاؤس گیا۔ اس کے چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ تھی۔

غریبوں کے مائی باپ۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے پیپلز پارٹی نے بھیجا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مسلم لیگی ہے۔ وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں اسے کسی بھی کیس میں گرفتار کر لینا چاہیے۔ اگر وہ بارڈر کے قریب پہنچ گیا تو ہمیں بہت نقصان پہنچے گا۔ ہم کوئی بھی الزام لگا کر اسے گرفتار کر سکتے ہیں۔

تم کیسے جانتے ہو کہ وہ مسلم لیگی ہے؟

سب انسپکٹر اعتماد سے مسکرایا۔ میں نے اس کے کپڑے وغیرہ اتروا دیئے تھے۔

حکم چند نے کچھ سوچتے ہوئے خالی گلاس کی طرف دیکھا اور مزید کہا۔ گرفتاری کے وارنٹ جلدی سے بناؤ۔ نام محمد اقبال

ولدیت: محمد۔ یا کچھ اور' یا باپ کا نام نامعلوم لکھ دو۔ ذات: مسلمان۔ پیشہ مسلم لیگی ورکر۔

سب انسپکٹر نے ڈرامائی انداز میں سیلوٹ کیا۔

ٹھہرو۔ ٹھہرو کوئی بھی چیز ادھوری مت چھوڑنا۔ اپنی پولیس ڈائری میں یہ تحریر کرو کہ ابھی تک رام لال کے قتل کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ لیکن امید ہے کہ اس کے متعلق معلومات جلدی مل جائے گی۔ تم اس میں جگا کا نام استعمال مت کرو۔

ہاں۔ سر۔ ڈاکو جانے سے پہلے اس کے صحن میں شیشے کی چوڑیاں پھینک گئے تھے۔ ظاہر ہے اس نے ان کی اس جان جوکھوں کے کام میں شامل ہونے سے معذرت کی تھی۔

اچھا۔ اس کا نام جلدی سے خارج کر دو۔ لیکن اگر ضروری ہو تو اسے مار لگا دو۔

سب انسپکٹر مسکرایا۔ میں چوبیس گھنٹوں میں ڈاکوؤں کی لسٹ میں سے اس کا نام نکال دوں گا۔ اور بغیر کسی مار دھاڑ کے۔

ہاں۔ ہاں۔ انہیں کسی بھی راستے سے نکال دو۔ حکم چند نے بے صبری سے جواب دیا۔

پولیس اسٹیشن کی ڈائری کے الگ کاغذ پر آج کے ان دو قیدیوں کی حراست کو کسی اور معاملے میں ڈال کر لکھ لو۔ وہاں پر کسی قسم کی گڑ بڑ نہ ہو۔

سب انسپکٹر نے دوبارہ سلوٹ کیا۔ میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔

اقبال اور جگا کو تانگے پر چندن نگر پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔

اقبال کو تانگے کی اگلی سیٹ کے درمیان میں عزت کی جگہ دی گئی کوچوان خود لکڑی کی بلی پر گھوڑے کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس کی اپنی سیٹ خالی تھی۔ جگت سنگھ پچھلی سیٹ پر دو پولیس والوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

یہ ایک لمبا اور ناپختہ سڑک پر گرد آلود سفر تھا جو کہ ریلوے پٹڑی کے متوازی چل رہا تھا۔ صرف جگا ہی پر سکون تھا۔ وہ پولیس والوں کو اور پولیس والے اس کو جانتے تھے۔ اس کیلئے یہ صورت حال اجنبی نہ تھی۔

تمہارے پولیس اسٹیشن میں ان دنوں تو بہت سے قیدی ہوں گے۔ جگا نے کہا۔

نہیں۔ صرف ایک۔ ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

ہم فساد کرنے والوں کو گرفتار نہیں کرتے۔ ہم صرف انہیں منتشر کر دیتے ہیں اور پھر یہاں اتنا وقت نہیں کہ دوسرے جرائم سے نبٹا جائے۔ ان سات دنوں میں گرفتار ہونے والے تم دونوں پہلے قیدی ہو۔ بہت سے قید خانے خالی پڑے ہیں۔ تم ان میں سے کسی ایک میں ٹھہر جانا۔

بابو جی۔ پسند کر لیں گے۔ جگا نے کہا۔ کر لیں گے۔ بابو جی؟

اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جگا کو اپنا دل ٹوٹتا محسوس ہوا اور اس نے جلدی سے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تمہیں بہت کام

کرنا پڑتا ہوگا۔ اس نے کانسٹیبل کو رائے دی۔

ہاں۔ یہاں پر ہر طرف قتل ہو رہے ہیں۔ اور پولیس کی ایک بڑی تعداد اس کو گھٹا کر آدھا کم کر چکی ہے۔

وہ پاکستان میں کیوں شامل ہو رہے ہیں؟

ہم نہیں جانتے۔ چاہے وہ دوسری طرف ہندوستان میں شامل ہو جائیں۔

آزادی والے دن۔ سپرٹینڈنٹ صاحب نے تمام مسلمان پولیس والوں سے اسلحہ چھین لیا تھا۔

مسلمان پولیس والوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ظلم کرنے والا کوئی بھی ہو وہ خدا کے قہر سے نہیں بچ سکتا۔ کوئی بھی خدا سے نہیں بچ سکتا' جگت سنگھ نے پر جوش انداز میں کہا۔ ہر کوئی تھوڑا سا حیران نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اقبال نے بھی مڑ کر اس بات کا یقین کرنے کیلئے دیکھا کہ یہ جگت سنگھ کی آواز تھی۔

کیا یہ ٹھیک نہیں ہے بابو جی۔ آپ ایک سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا کوئی خدا کے قہر سے بچ سکتا ہے۔

اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔

نہیں۔ یقیناً نہیں۔ جگا نے اپنے آپ کو جواب دیا۔ میں آپ کو کچھ بتاتا ہوں جو کہ مجھے بھائی میت سنگھ نے بتایا تھا۔ یہ ایک روپے کی قیمت کی سننے والی بات ہے۔ وہ یہ کہ مطلقاً ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے ہیں۔

ہر روپے کی قیمت سولہ آنے ہے۔ اقبال کی دلچسپی نہ لینے کے باوجود جگا بولتا رہا۔

بھائی نے مجھے ایک ٹرک کے بارے میں بتایا جو کہ بلوچ سپاہیوں سے بھرا ہوا امرتسر سے لاہور جا رہا تھا۔ جب وہ پاکستان کی سرحد کے قریب پہنچتے تھے تو سپاہی سڑک کے ساتھ چلنے والے سکھوں کو سنگین مارنا شروع کر دیتے۔

سنو۔ بابو جی۔ یہ مول کی سننے والی بات ہے۔ ایک آوارہ کتا سڑک عبور کرنے کیلئے دوڑا۔ وہی ٹرک ڈرائیور جو بہت سے لوگوں کو قتل کرنے کا ذمہ دار تھا۔ کتے کو بچانے

کیلئے تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔ گندھے غلیظ آوارہ کتے کیلئے۔ وہ درخت سے ٹکرا گیا۔ ڈرائیور اور دو سپاہی مارے گئے۔ جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ تم اس کو کیا کہتے ہو؟

ان کی باتیں سن کر اقبال کو غصہ آ رہا تھا۔ اس حادثے کا کون ذمہ دار ہوا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

خدا۔ یقیناً۔ ان پولیس والوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ایک شخص جو کہ انسانوں کو مار کر خوش ہو رہا تھا اس نے ایک راستہ بھولے کتے کو اپنے پہیوں کے نیچے آنے سے بچانے کیلئے یہ سب کچھ کیوں کیا؟

تم مجھے بتاؤ۔ اس نے نرمی سے اقبال سے کہا۔ لیکن اقبال خاموش رہا۔ پھر جگا کوچوان کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے دوبارہ اپنے گھوڑے کو چابک مارنے شروع کر دیئے تھے۔

بھولا۔ کیا تمہیں خدا کا کوئی خوف نہیں جو اپنے جانور کو اس طرح مار رہے ہو۔ معاف کر دو؟

بھولا نے گھوڑے کو مارنا بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر برا منانے کا تاثر تھا۔ یہ اس کا گھوڑا تھا اور وہ اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا تھا۔ بھولیا! ان دنوں کاروبار کیسا جا رہا ہے؟ جگا نے بات بناتے ہوئے پوچھا۔ خدا بڑا رحم کرنے والا ہے۔ کوچوان نے اپنے چابک سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر جلدی سے بولا انسپکٹر صاحب بھی بہت مہربان ہیں۔ ہم زندہ ہیں اور اپنے پیٹ بھرنے کا انتظام کرتے ہیں۔

کیا تم ان مہاجروں سے پیسے نہیں بناتے جو کہ پاکستان جانا چاہتے ہیں؟

پیسے کیلئے میں اپنی زندگی گنوا دوں۔ بھولے نے غصے میں پوچھا۔

نہیں شکریہ بھائی۔ تم اپنی نصیحت اپنے پاس رکھو۔ جب لوگ حملہ کرتے ہیں تو وہ یہ جاننے کیلئے انتظار نہیں کرتے۔ کہ تم کون ہو ہندو یا مسلمان۔ وہ مار دیتے ہیں۔ ایک دن چار سکھ سردار جیپ میں سفر کر رہے تھے وہی سڑک کے ساتھ ہی مسلمان مہاجرین پر پیدل چل رہے تھے۔ بغیر بتائے انہوں نے ان پر اپنی اسٹین گن سے فائر کھول دیا۔ چار اسٹین

گئیں! صرف خدا ہی جانتا ہے ان میں سے کتنے مرے۔ کیا ہو گا اگر مسلمانوں کا جمِ غفیر میرے ٹانگے کو پکڑے۔ وہ سب سے پہلے مجھے قتل کریں گے اور پوچھیں گے بعد میں۔ آخر کیوں ایک کتا جیپ کے نیچے نہیں آیا اور اسے خراب نہیں کیا؟ اقبال نے طنزیاً پوچھا۔

گفتگو کے درمیان ایک بدوضع سا وقفہ آیا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس جلے بھنے بدمزاج بابو کو کیا کہیں۔ جگا نے معصومیت سے پوچھا۔

بابو جی! کیا آپ کو اس پر یقین نہیں کہ برے کام کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ اسی لیے بھائی بھی ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔

گورو نے بھی اپنی کتاب میں یہی سب کچھ کہا ہے۔

ہاں یقیناً۔ ایک روپے میں سولہ آنے ہی ہوتے ہیں۔ اقبال نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

اچھا جی۔ کیا یہ آپ کی اپنی رائے ہے۔ جگا نے مسلسل مسکراتے ہوئے کہا۔ آپ عام لوگوں سے کبھی بھی متفق نہیں ہوں گے۔ وہ دوبارہ کوچوان سے مخاطب ہوا۔

بھولیا! میں نے سنا ہے بہت سی عورتوں کو جبراً اغوا کیا گیا ہے اور سستے داموں بیچ دیا گیا ہے۔ تم اپنے لیے بھی کوئی بیوی حاصل کر سکے۔

کیوں سردارا اگر تم نوراں کو کچھ دیئے بغیر حاصل کر سکتے ہو تو کیا میں کمزور ہوں کہ ایک اغوا شدہ عورت خریدوں بھولا نے جواب دیا۔

جگا ششدر رہ گیا' اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ اس کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔ پولیس والے جو کہ چپکے چپکے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر جگت سنگھ کی طرف دیکھا۔ بھولا نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

کیوں۔ جگا۔ اس نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔ تم دوسروں کا مذاق اڑا لیتے ہو لیکن جب کوئی حاضر جوابی سے جواب دے تو تم ناراض ہوتے ہو۔

اگر یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں مجھ پر نہ ہوتیں تو میں تیرے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ چکا ہوتا۔ جگا نے سخت غصے میں کہا۔ تم خوش قسمت ہو کہ آج بچ گئے لیکن اگر میں نے

سنا کہ تم نے یہ بات دوبارہ دہرائی ہے تو میں تمہارے منہ سے تمہاری زبان کھینچ ڈالوں گا۔ جگا نے زور سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

بھولا مکمل طور پر ڈر گیا تھا۔ غصہ مت کرو۔ میں نے کیا......؟

حرامی۔ جگا بڑبڑایا۔

یہ گفتگو کا انجام تھا۔ تانگے کی بے چین کر دینے والی خاموشی کو گھوڑے کو دی جانے والی کوچوان کی گالیاں توڑتی تھیں۔ جگا ناراضگی میں اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ چوری چھپے ہونے والی ملاقاتیں عام لوگوں کے علم میں تھیں۔ غالباً کسی نے اسے دیکھا ہو گا۔ اور نوراں نے دوسروں سے باتیں کی ہوں گی۔ یہ ضرور افواہیں پھیلانے والوں نے شروع کیا ہو گا۔ اگر ایک چندن نگر کا کوچوان یہ بات جان گیا ہے تو پھر منوں مجرا کا ہر انسان اس کے بارے میں باتیں کرتا ہو گا۔ آخری سیکھنے والی بات یہ تھی کہ افواہیں پھیلانے والے محفلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید امام بخش اور اس کی بیٹی نوراں گاؤں کے لوگوں میں سے ایک تھے جو کہ ان باتوں کے متعلق قطعاً کچھ نہیں جانتے۔

پارٹی دوپہر کے بعد چندن نگر پہنچ گئی۔

ٹانگا پولیس اسٹیشن سے پرے آ کے رک گیا۔ جو کہ قصبے سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ قیدی حفاظتی دستے کے ساتھ محراب سے ہوتے ہوئے گیٹ کی طرف آئے جس کے اوپر بڑے بڑے الفاظوں میں خوش آمدید تحریر تھا۔ انہیں سب سے پہلے رپورٹ کرنے والے کمرے میں لے جایا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ایک بڑا سا رجسٹر کھولا اور ایک الگ کاغذ پر آج کے دن کے واقعات تحریر کیے۔ میز کے اوپر ایک پرانے فریم میں کنگ جارج ششم کی تصویر لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ اردو میں ایک اشتہار لکھا ہوا تھا۔ ''رشوت خوری ایک جرم ہے۔''

دوسری دیوار پر گاندھی کی ایک پرانی تصویر لگی ہوئی تھی جو کہ کسی کیلنڈر سے پھاڑی گئی تھی۔ اس کے نیچے انگلش میں ایک اصول عمل تحریر تھا۔ ''دیانتداری ایک بہتر حکمت عملی ہے۔'' کمرے میں موجود دوسری تصاویر فرار ہونے والے مجرموں۔ برے کردار اور گم شدہ انسانوں پر مشتمل تھیں۔ روز کی ڈائری میں تحریر ہونے کے بعد قیدیوں کو صحن پار

کر کے ان کے قید خانے میں لے جایا گیا۔ پولیس اسٹیشن میں صرف دو قید خانے تھے جو صحن کے ایک طرف پولیس والوں کی بیرک کے سامنے تھے۔ دیوار کے مزید آخری مربع حصے کو بیل کے ذریعے ڈھانکا گیا تھا۔

جگا کا پہنچنا ایک ترنگ والا موضوع تھا۔

اوئے۔ تم پھر واپس آ گئے ہو۔ تم سوچتے ہو کہ یہ تمہارے سسر کا گھر ہے۔ ایک کانسٹیبل اپنی بیرک سے چلایا۔

یہ دیکھو اب پولیس والے کی بیٹی کا نمبر ہے۔ میں اسے پھنسا کر چکا ہوں۔ جگت سنگھ نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ وہ ٹانگے پر ہونے والے ناخوشگوار واقعے کو بھول چکا تھا۔

اوئے بدمعاشہ۔ تو اپنی بدمعاشی سے باز نہیں آئے گا۔ صبر کر جب تک کہ انسپکٹر صاحب نہ سن لیں کہ تو نے کیا کہا ہے۔ ورنہ وہ تیرے سب سے نچلے حصے پر گرم مرچیں ڈالیں گے۔

تم اپنے جوائی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔

اقبال کے ساتھ صورت حال مختلف تھی۔ معذرت کر کے اس کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ ایک کرسی۔ ایک میز اور ایک چارپائی اس کے قید خانے میں رکھی گئی تھی۔ کانسٹیبل نے روزانہ کے انگلش اردو اخبارات اور میگزین اکٹھے کئے اور قید خانے میں دے دیئے۔ اقبال کو پیتل کی پلیٹ میں کھانا دیا گیا۔ ایک چھوٹا سا منکا اور ایک شیشے کا گلاس اس کی میز پر چارپائی کے ساتھ رکھے گئے تھے۔

جگا کو اس کے قید خانے میں کوئی فرنیچر نہیں دیا گیا تھا۔ اس کا کھانا جاہلانہ انداز میں اس کی طرف پھینک دیا جاتا اور وہ اپنی چپاتیاں ہاتھوں میں لے کر کھا لیتا۔ ایک کانسٹیبل لوہے کی سلاخوں میں سے اس کی ہتھیلی کے بنے پیالے۔ میں پانی انڈیل دیتا۔ جگا کا بستر سیمنٹ کا سخت فرش تھا۔

رویئے کے اس فرق نے اقبال کو حیران نہیں کیا۔ جس ملک میں کئی صدیوں سے ذات پات کا فرق تسلیم کیا جا رہا تھا وہاں یہ پیدائشی ناہمواری ذہنی تصور بن چکا تھا اگر

ذات پات کے اس فرق کو قانون سازی سے یکسر ختم کر دیا جاتا تو پھر یہ کسی اور شکل میں طبقاتی بحث بن جاتی۔

مغربی طرز زندگی ایسی ہوتی ہے۔ جیسے دہلی۔ میں گورنمنٹ سیکرٹریٹ کے ملازمین۔ وہاں پر گاڑیاں پارک کرنے کیلئے ان کو ان کی حیثیت کے مطابق جگہ دی جاتی تھی۔ اور بے شک بڑے بڑے سرکاری افسروں کے دفتر جانے کیلئے راستے مخصوص ہوتے تھے۔ باتھ روم رتبے وعہدے کے مطابق دیئے جاتے تھے اور انہیں لیب کر دیا جاتا تھا۔ جیسے سینئر آفیسرز' جونیئر آفیسرز' کلرک' اسٹینوگرافرز اور دوسرے عہدے دار طبقوں کو مکمل طور پر جدا کر دیا جاتا تھا۔ نیز ان کے سوشل اسٹیٹس کے مطابق رتبے دیئے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو ملزم ہوتے تھے یا ایسے ہی کسی جرم میں مجرم قرار دیئے جاتے تھے۔ ظاہر وضع قطع سے بے جوڑ نہیں لگے۔

اقبال کو قید خانے میں اے کلاس دی گئی جبکہ جگا سی کلاس کے نچلے طبقے میں سے تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اقبال چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے جگا کے قید خانے میں سے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن وہ خود نیند سے بہت دور تھا۔ اس کا دماغ ایک گھڑی کے سپرنگ کی مانند گھوم رہا تھا کہ جس کو اگر ایک دفعہ کھولیا جاتا تو وہ کئی گھنٹوں تک تھرتھراتا رہتا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اخباروں کے ڈھیر کو اوپر نیچے کرنے لگا جو کہ ایک کانسٹیبل اس کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ وہ سب اخبارات ایک جیسے ہی تھے۔ ایک جیسی خبریں۔ ایک جیسے بیانات اور ایک جیسے اداریے سوائے بڑی سرخیوں کے لفظوں کے وہ سب ایک ہی ہاتھ کے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ تصویریں بھی ایک جیسی تھیں۔ وہ شادی سے متعلق اشتہاروں کی طرف متوجہ ہوا۔ بعض اوقات اس میں تفریح و مشاغل کا سامان ہوتا تھا۔ لیکن پنجاب کی جواں نسل ایسی ہی تھی جس طرح کی خبریں۔ سب خوبصورت کنواری دوشیزہ چاہتے تھے۔ چند ایک جو شاید وسیع ذہن کے مالک تھے۔ بیوہ سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن صرف اس صورت میں کہ ان کے اولاد نہ ہو۔ وہ تمام خواتین جو گھریلو خانہ داری کے معاملات میں ماہر تھیں ان کی بہت ڈیمانڈ تھی جبکہ ماڈرن اور مخیر حضرات کیلئے ذات اور جہیز کی کوئی قید نہیں تھی۔ بہت کم امیدوار اپنی ہونے

والی بیویوں کی تصاویر منگواتے تھے۔ خوبصورتی جو تسلیم کی جاتی تھی بس سطحی سی ہوتی تھی۔
بہت سے زائچے سے حساب کتاب کر کے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ستاروں کی ہم آہنگی خوشگوار زندگی کی ایک گارنٹی تھی۔ یہ سب پڑھنے کے بعد اقبال نے اخبار دور پھینک دیا۔ اور میگزین کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اگر کوئی بات جو ان سے اخبار میں رہ گئی ہو وہ بری حالت میں اس میں مل جائے۔ کسی ایجنڈے کے اوپر روز لکھا جانے والا اداریہ نقش دیوار کی مانند ہوتا تھا۔ انڈین سنگت ناچ کے بارے میں اداریہ ہوتا تھا۔ اس میں ٹیگور کے بارے میں اداریہ تحریر ہوتا تھا۔ پریم چند کی کہانیوں پر اداریے لکھے جاتے تھے فلمی ستاروں کی نجی زندگی کے بارے میں اداریے تحریر ہوتے تھے۔ اقبال' میگزین چھوڑ کر دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ ہر چیز سے گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ یہ تو اس کے ساتھ ہونا ہی تھا۔ کیونکہ وہ تین دن سے مشکل سے سو پا رہا تھا۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ کیا یہ قربانی سمجھی جائے گی۔ یہ ممکن تھا۔ اسے اپنی پارٹی تک یہ سب باتیں بھیجنے کیلئے کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہیے۔
تب شاید......؟

وہ سو گیا۔ خواب میں اس نے بڑے بڑے جلی حروف میں لکھے ہوئے جھنڈے دیکھے جو کہ اس کی گرفتاری۔ اس کی رہائی۔ اس کی کامیابی کا اعلان کر رہے تھے ایک لیڈر کی طرح برآمد ہونے کی۔

شام کو ایک سپاہی اقبال کے قید خانے میں ایک اور کرسی رکھنے آیا۔ کیا میرے قید خانے میں کوئی اور آ رہا ہے؟ اقبال نے تھوڑا پریشان ہو کر پوچھا
نہیں۔ بابو جی! صرف انسپکٹر صاحب۔ وہ آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں وہ آ رہے ہیں۔

اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاہی کرسی کی حالت کو درست کرنے کیلئے کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر وہ چلا گیا۔ غلام گردش میں باتوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور پھر سب انسپکٹر سامنے آ گیا۔
کیا مجھے اندر آنے کی آپ کی اجازت ہے؟
اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں آپ کیلئے کیا کر سکتا ہوں۔ انسپکٹر صاحب

ہم آپ کے غلام ہیں۔ مسٹر اقبال۔ آپ کو ہمیں حکم دینا چاہیے اور ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ سب انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اسے اپنی آواز و لہجے کو بدلنے کی قابلیت پر فخر تھا۔ ضرورت کے مطابق یہ تہذیب و شائستگی موقع شناسی تھی۔
میں نہیں جانتا تھا کہ آپ جن لوگوں کو قتل کرنے کیلئے گرفتار کرتے ہیں ان پر اتنے مہربان ہوتے ہیں۔ مجھ پر قتل کا الزام ہے اسی لئے آپ مجھے یہاں لائے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہے؟ مجھے یقین نہیں۔ آپ کے پولیس والوں نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میں پرسوں منوں مجرا اسی ٹرین پر آیا ہوں جس پر وہ آئے ہیں۔
ہم نے کوئی الزام نہیں لگایا۔ یہ عدالت کا کام ہے۔ ہم نے آپ کو صرف شک و شبہ کی بناء پر یہاں بٹھایا ہوا ہے۔ ہم سرحدی علاقے میں سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے والوں کو آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔
سب انسپکٹر مسلسل مسکراتا رہا۔ پھر یکایک بولا۔ تم یہاں سے کیوں نہیں چلے جاتے۔ اپنا پروپیگنڈہ پاکستان میں جا کر کرو۔ جہاں سے تمہارا تعلق ہے؟
اقبال کو غصہ آ گیا۔ لیکن اس نے اپنا غصہ چھپانے کی کوشش کی۔ پاکستان سے تعلق ہونے سے آپ کا صحیح مطلب کیا ہے۔ انسپکٹر صاحب'
تم مسلمان ہو۔ تم پاکستان جاؤ۔ انسپکٹر بولا
یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ اقبال پھٹ پڑا۔
اور کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ تم ترپ کی چال چل کر ایک جھوٹے کیس کے ذریعے صرف اپنی بے وقوفی کو چھپانا چاہتے ہو۔ سب انسپکٹر جواباً بدمزاجی سے بولا۔
تمہیں اپنی زبان سنبھال کر بات کرنی چاہیے۔ مسٹر اقبال۔ میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ کہ تمہاری خباثت سننے کیلئے یہاں رکا رہوں۔ تمہارا نام اقبال ہے اور تمہارے ختنے ہوئے ہیں۔ میں نے خود تمہیں دیکھا ہے اس کے علاوہ تم منوں مجرا میں اپنی موجودگی کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکے۔ یہ ہی کافی ہے۔
جب یہ معاملہ عدالت اور اخبارات میں جائے گا تو یہ سب کچھ کافی نہیں ہوگا۔

میں مسلمان نہیں ہوں اور ایسی کوئی بات نہیں اور یہ جاننا آپ کا کام نہیں کہ میں منوں مجرا کیا کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے چوبیس گھنٹوں میں رہا نہیں کیا۔ تو میں حبسِ بے جا کی درخواست پیش کر دوں گا اور تمہاری ڈیوٹی سے متعلق عدالت تمہیں راستہ بتائے گی۔

حبسِ بے جا کی درخواست؟ سب انسپکٹر زور سے ہنسا۔

لگتا ہے تم بیرون ملک طویل عرصے تک رہ چکے ہو۔ مسٹر اقبال اب تک تم بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہو۔ تم رہو اور سیکھو۔ سب انسپکٹر اچانک اٹھا اور قید خانہ چھوڑ کر چلا گیا۔ قید خانے کے دروازے کو دوبارہ تالا لگا دیا گیا۔ سب انسپکٹر نے دوسرے قید خانے کا دروازہ کھول لیا جس میں جگت سنگھ بند تھا۔ ''ست سری کال۔ انسپکٹر صاحب۔'' جگت سنگھ نے سب انسپکٹر کو دیکھ کر کہا۔

سب انسپکٹر نے اس کے خیر مقدم کا کوئی خیال نہیں کیا۔'' تم اپنی یہ بدمعاشی کب تک چھوڑو گے۔''

''موتیاں والی سرکار! آپ کیا چاہتے ہو لیکن اس بار میں بے گناہ ہوں۔ میں گورو کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ جگا فرش پر ہی بیٹھا رہا۔ سب انسپکٹر دیوار کی دوسری سمت کھڑا ہو گیا۔

تم ڈاکے کی رات کہاں تھے؟

میں نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر کچھ نہیں کیا تھا۔ جگا نے ٹال مٹول کرتے ہوئے جواب دیا۔

تم ڈاکے کی رات کہاں تھے؟ سب انسپکٹر نے دہرایا۔ جگا نے فرش کی طرف دیکھا۔ میں اپنے کھیتوں میں گیا تھا۔ اس رات پانی دینے کی میری باری تھی۔

سب انسپکٹر جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں کسی دوسرے آدمی سے تمہاری باری کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں کیا تم نے نمبردار کو اطلاع دی تھی کہ تم گاؤں سے باہر جا رہے ہو؟

جگا نے اپنے پاؤں زمین پر رگڑے اور مسلسل فرش کی طرف دیکھتا رہا۔'' تمہاری ماں نے بتایا تھا کہ تم جنگلی سوروں کو بھگانے کیلئے گئے تھے۔''

جگا اپنے پاؤں زمین پر رگڑتا رہا۔ ایک طویل وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔

''میں ڈاکوؤں کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا تھا۔ میں بے گناہ ہوں۔''

ڈاکو کون تھے؟

سب انسپکٹر نے پوچھا

میں کیسے جان سکتا ہوں کہ وہ ڈاکو کون تھے؟ اس وقت میں گاؤں سے باہر تھا اور ویسے بھی آپ خود سوچیے کہ کوئی بھی منوں مجرا میں ڈاکہ ڈالنے اور قتل کرنے کی جرات کر سکتا ہے؟

ڈاکو کون تھے؟ سب انسپکٹر نے سخت لہجے میں دھمکی دیتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم انہیں جانتے ہو۔ یقیناً وہ بھی تمہیں جانتے ہیں۔ وہ تمہارے لئے کانچ کی چوڑیوں کا تحفہ چھوڑ گئے تھے۔'' جگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لگتا ہے تو اپنے کولہوں پر چابک کھانا چاہتا ہے۔ یا تو لال مرچیں ڈالوا کر ہی بولے گا؟

جگا کو جھرجھری سی آ گئی۔ وہ سب انسپکٹر کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ ان سب مراحل سے ایک دفعہ پہلے گزر چکا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں باندھ کر انہیں چارپائی کے پایوں کے نیچے رکھ کر اس پر چھ سے زیادہ پولیس والے بیٹھ گئے تھے۔ وہ درد کی وجہ سے بے حس ہو گیا تھا۔ پھر لال مرچ کے پاؤڈر کو گندے ہاتھوں سے ڈالا گیا۔ اور کئی دنوں تک اس کے آخری حصے میں آگ لگنے کا احساس ہوتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ نہ کھانا نہ پینا یا چمکتے ہوئے گول برتن میں گرم مصالحے دار کھانا اور ٹھنڈا پانی جیل کوٹھڑی کے باہر رکھ دیا جاتا جو کہ ایک آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتا تھا۔ یادوں نے اسے ہلا دیا۔

نہیں نہیں۔ اس نے کہا۔ خدا کیلئے نہیں۔

اس نے اپنے آپ کو زور سے فرش پر پھینکا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سب انسپکٹر کے جوتے پکڑ لئے۔

مہربانی کر موتیاں والی سرکار۔

اسے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ دوبارہ ان کی اذیت

کو برداشت نہیں کر سکتا۔

میں بے گناہ ہوں لیکن گورو کی قسم! میں ڈاکوؤں کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا تھا۔

چھ فٹ چار انچ کے آدمی کو اپنے پاؤں میں پڑا دیکھ کر سب انسپکٹر کو بہت فخر محسوس ہوا۔ وہ کسی ایک کو بھی نہیں جانتا تھا کہ جس نے جسمانی تکلیف دیئے بغیر کسی کو کنٹرول کیا ہو۔ اذیت دینے کے طریقے کار کو بڑے احتیاط سے چنا جاتا ہے۔ کچھ شکار قیدیوں کو بھوکا رکھ کر۔ جبکہ اقبال کی طرح کے لوگ دوسروں کو پولیس والوں کے سامنے ننگا دیکھ کر تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچھ کے چہروں پر شیرہ مل کر مکھیاں بیٹھنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا اور ان کے ہاتھ بھی پیچھے باندھ دیتے۔ کچھ کو سونے سے روکتے۔ آخر میں وہ سب جھک جاتے۔

میں تمہیں دو دن دوں گا۔ مجھے ان ڈاکوؤں کے نام بتا دو۔ اس نے کہا۔ نہیں تو میں تمہارے پیچھے اتنا ماروں گا کہ وہ مینڈھے کی دم لگے گی۔

سب انسپکٹر نے جگا کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑوائے اور باہر نکل گیا۔ اس کا یہ دورہ ناکام ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنی حکمت عملی بدلنی ہو گی۔ ان دو لوگوں سے نبٹنے میں اسے ناکامی ہوئی تھی جو کہ اس کیلئے بالکل مختلف بات تھی۔

○

برُا دور

ستمبر کی ابتداء ہی سے منوں مجرا کا شیڈول غلط ہو رہا تھا۔ ٹرینیں باقاعدہ وقت پر آتی تھیں جو کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اور بہت سی راتوں کو بھی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔

دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اگر کسی کو یاد کرانا بھول جاتا تھا۔ تو امام بخش میت سنگھ کا انتظار کرتے تھے کہ وہ پہلے شروع کرے۔ میت سنگھ اٹھنے سے پہلے مؤذن کی نماز کیلئے اذان دینے کا انتظار کرتا۔ لوگ اپنے بستروں میں دیر تک لیٹے رہتے یہ جانے بغیر کہ وقت بدل چکا ہے اور میل ٹرین کسی بھی صورت میں اسی وقت نہیں چل سکتی۔ بچے نہیں جانتے تھے۔ کہ بھوک کب لگتی ہے وہ ہر وقت کھانے کیلئے شور مچاتے۔ شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے تک سب اپنے گھروں میں رہتے اور ایکسپریس کے آنے سے پہلے بستروں میں گھس جاتے تھے اگر وہ آ جائے۔ تو بس پھر ان کو سلانے کیلئے لوری کے ساتھ کسی تھپکی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ گھوسٹ ٹرین آدھی رات سے لیکر طلوع صبح سے ذرا دیر پہلے تک چلتی اور منوں مجرا کے لوگوں کے خوابوں کو بے چین کرتی۔

گاؤں کی زندگی میں صرف یہی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ سکھ سپاہیوں کا ایک یونٹ وہاں پہنچ چکا تھا اور انہوں نے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک خیمے گاڑ لئے تھے۔ انہوں نے پل کے نزدیک چھ فٹ اونچا مربع شکل میں ایک ریت کا مورچہ تعمیر کیا تھا اور ہر ٹیلے

کے سامنے کے حصے میں سٹین گن رکھی ہوئی تھی۔ مسلح سپاہیوں نے پلیٹ فارم سے پٹرول دینا شروع کر دیا تھا اور کسی بھی گاؤں والے کو زینے کے جنگلے کے قریب آنے کی اجازت نہ تھی۔ تمام گاڑیاں جو کہ دہلی سے آتی تھیں۔ پاکستان جانے سے پہلے یہاں رکتیں۔ ان کے ڈرائیور اور گارڈ بدلے جاتے۔ اور جو گاڑیاں پاکستان سے آ رہی ہوتیں ان کے انجن کو یہاں ریسٹ دیا جاتا۔

ایک صبح پاکستان سے آنے والی ایک ٹرین منوں مجرا کے ریلوے اسٹیشن پر آ کے رکی۔ پہلی ہی سرسری نظر میں ٹرین کو دیکھ کر لگا کہ امن کے دن ہیں۔ کوئی بھی چھتوں پر نہیں۔ بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی بھی بوگیوں کے درمیان لٹکا ہوا نہیں تھا۔ کوئی بھی ڈبے کی سیڑھیوں پر موجود نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بہت مختلف تھا۔

یہاں پر کچھ بے چینی سی تھی۔ یہ بھوتوں کی خاصیت تھی۔ جیسے تیسے یہ پلیٹ فارم پر آ کر رکی ٹرین کے آخری حصے سے گارڈ نمودار ہوا اور اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں چلا گیا۔ اور آفیسر انچارج سے باتیں کیں۔

سپاہیوں نے چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو کہا کہ وہ واپس منوں مجرا چلے جائیں۔

ایک آدمی کو موٹر سائیکل پر چندن نگر بھیجا گیا۔ ایک گھنٹے بعد سب انسپکٹر پندرہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ اس کے فوراً بعد مسٹر حکم چند اپنی امریکن کار میں وہاں آ گئے۔

گھوسٹ ٹرین کی آمد کے بعد دن چڑھے تک منوں مجرا میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ اپنی چھتوں پر یہ دیکھنے کیلئے کھڑے ہو گئے کہ اسٹیشن میں کیا ہوا ہے؟ وہ سب ٹرین کے اوپری کالے حصے کو دیکھ سکتے تھے۔ جو کہ پلیٹ فارم کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھنے والوں کو صرف اسٹیشن کی عمارت اور ٹرین کے گرد لگے جنگلے نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک فوجی اور ایک سپاہی اسٹیشن سے باہر آئے اور پھر واپس چلے گئے۔

دوپہر میں بہت سے آدمی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اکٹھے ہو کر ٹرین پر بحث

کرنے لگے۔ یہ ٹولیاں پیپل کے درخت کے نیچے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں اور پھر سب گوردوارے میں چلے گئے وہ عورتیں جو دروازے دروازے جا کر افواہیں سناتی اور سنتی تھیں۔ نمبردار کے گھر جمع ہو گئیں اور اپنے آدمیوں کا انتظار کرنے لگیں کہ وہ گھر آئیں اور انہیں بتائیں کہ ٹرین کے بارے میں وہ کیا جان کر آئے ہیں۔

منوں مجرا کا یہی طریقہ کار تھا کہ اگر گاؤں میں کچھ ہو جاتا تو اس کے نتیجے کو جاننے کیلئے خواتین نمبردار کے گھر چلی جاتیں اور مرد حضرات گردوارے۔

گاؤں کا کوئی قانونی لیڈر نہیں تھا۔ بانتا سنگھ نمبردار صرف انکم ٹیکس کا ایک ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہ پوسٹ اس کے خاندان میں نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس کے پاس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ زمین نہ تھی اور کسی دوسرے طریقے کار سے بھی وہ نمبردار نہیں بن سکتا تھا۔ اسے خود بھی اپنے بارے میں پختہ یقین نہیں تھا۔ وہ اپنے دوسرے گاؤں کے ساتھیوں کی طرح شریف اور محنتی کاشتکار تھا۔ لیکن جب سے سرکاری اہلکار اور پولیس والوں کو اس سے واسطہ پڑا تھا اس کی بھی سرکاری حیثیت ہو گئی تھی۔

کوئی بھی اسے اس کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ اسے او نمبردارا کہا جاتا تھا جیسے اس کے باپ اور اس کے باپ کے باپ اور اس کے باپ کے باپ کے باپ کو اس سے پہلے کہا جاتا تھا۔

صرف مسجد کے مولوی امام بخش اور بھائی میت سنگھ وہ انسان تھے جو کہ گاؤں کی پنچائیت میں اپنی رائے بیان کر سکتے تھے۔ امام بخش ایک جولاہا تھا اور پنجاب میں روایتی طور پر جولاہے مزاح کا باعث ہوتے ہیں۔ انہیں بزدل اور نامرد سمجھا جاتا ہے۔ جن کی عورتیں ہمیشہ دوسروں سے تعلقات رکھتی ہیں۔ لیکن امام بخش کی عمر اور محبت نے اسے معزز بنا دیا تھا اس کے خاندان میں ہونے والے مسلسل المیوں نے اسے قابل رحم اور مرکز نظر بنا دیا تھا۔ پنجابی لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی بیوی اور ایک واحد بیٹا کچھ دنوں میں ہی ایک دوسرے کے بعد فوت ہو گئے۔ اس کی آنکھیں جن سے پہلے ہی صاف نظر نہیں آتا تھا اچانک مزید خراب ہو گئیں۔ اور وہ اپنی کھڈیوں پر بھی کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ وہ اپنی چھوٹی سی بچی نوراں کی دیکھ بھال کیلئے فقیری پر مجبور ہو گیا۔

اس نے مسجد میں رہنا شروع کر دیا اور مسلمان بچوں کو قرآن پڑھانے لگا۔ وہ قرآنی آیتیں لکھ کر گاؤں کے لوگوں کو جادو ٹونے سے بچنے کیلئے پہننے کو دیتا یا بیماری کی صورت میں دوائی کی طرح نگلنے کو دیتا۔

چھوٹے نذرانے جیسے آٹا۔ سبزیاں۔ کھانا اور کپڑے اسے اور اس کی بیٹی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اسے کہاوتیں، حکایتیں اور ضرب المثل سنا کر امید سے زیادہ پیسہ مل جاتا تھا جو کہ گاؤں کے کسان خوشی خوشی سنتے تھے۔ اس کی آمد کو عزت دی جاتی تھی۔ وہ ایک لمبا دبلا پتا آدمی تھا۔ اس کے بے کیف حسن کو سفید بالوں کی لڑی نے تحفظ دیا ہوا تھا جو کہ اس کے سر کے پیچھے ایک کان سے دوسرے کان تک گھوم رہے تھے اور اس کی صاف ستھری سفید ریشمی بالوں کی داڑھی تھی جو کہ وہ موقع پر مہندی سے رنگ کر تیز سرخ کر لیتا تھا۔

آنکھوں کے موتیے کی وجہ سے وہ فلسفی سا دکھائی دیتا تھا۔ ساٹھ سال کی عمر ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو سیدھا کھڑا رکھتا تھا۔ ان سب چیزوں نے اسے ایک الگ پہچان دی۔ وہ گاؤں والوں میں امام بخش یا مولانا کے نام سے نہیں پہچانا جاتا تھا بلکہ اسے چچا یا انکل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

میت سنگھ کو اس طرح کی صحبت یا عزت نہیں ملی تھی۔ وہ صرف ایک کسان تھا جو کہ اپنے کاموں سے وقت بچا کر مذہب کیلئے وقف کر دیتا تھا۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جو کہ اس نے پٹے پر دی ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وہ گردوارے میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی کوئی بیوی یا بچہ نہیں تھا۔ اس نے الہامی کتابوں سے کچھ نہیں سیکھا تھا اور اس میں تقریر کرنے کی بھی قابلیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ظاہری شخصیت اس کے خلاف تھی۔ وہ چھوٹے قد کا موٹا سا لمبے بالوں والا انسان تھا وہ امام بخش کا ہم عمر تھا۔ لیکن اس کی داڑھی بکھری ہوئی نہیں تھی۔ یہ کالی تھی اور اس میں سرمئی رنگ کی دھاری تھی۔ وہ چست نہیں تھا۔ وہ اپنی پگڑی اسی وقت پہنتا تھا۔ جب اسے اپنی مذہبی کتاب پڑھنی ہوتی تھی۔ ورنہ عام طور پر اپنے لمبے بالوں کو چھوٹی سی لکڑی کی کنگھی سے ہلکی سی گرہ سے باندھے رکھتا تھا عام طور پر اس کے آدھے بال گردن کی گدی پر بکھرے رہتے

تھے۔ وہ کبھی کبھار قمیض پہنتا تھا ورنہ اس کے واحد کپڑے جانگیہ کا ایک جوڑا تھا جو کہ ہمیشہ میل سے چکنا رہتا تھا۔ لیکن میت سنگھ بہت پر امن انسان تھا۔ اس میں امام بخش کیلئے کسی قسم کی حسد و جلن نہ تھی۔ وہ صرف یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ اسے اپنی عوام کا مرہون منت ہونا چاہیے جو کہ امام بخش کے مشورے پر اس کی رائے مانگتے تھے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ مد مقابل بیٹھے دوستوں کی طرح ہوتی تھی۔

گوردوارے میں ہونے والی مجلس ملن چولی کے ماحول میں ہوتی تھی۔ لوگوں کو بہت کم بولنا ہوتا تھا اور جو بولتے تھے وہ آہستہ آہستہ بولتے جیسے کسی پیغمبر کے سامنے بولا جاتا ہے۔

امام بخش گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔ اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم بہت برے وقت میں رہ رہے ہیں۔

کچھ لوگوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ہاں برے دن۔

میت سنگھ نے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہاں چچا۔ یہ تو کل یگ ہے۔ برا دور۔

ایک طویل خاموشی طاری ہوگئی اور لوگ اپنے پہلو بدلنے لگے۔ کچھ جمائی لے کر اپنا منہ بند کرتے ہوئے اونچی آواز میں اللہ کو پکارنے لگے۔ یا اللہ اور کچھ واہے گورو۔ واہے گورو۔ نمبردار۔ امام بخش نے دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

تم جانتے ہو کہ کیا ہو رہا ہے؟ ڈپٹی صاحب تمہارے لئے کچھ بھیجتے کیوں نہیں ہیں؟

میں یہ کیسے جان سکتا ہوں؟ چچا! جب وہ میرے لئے پیغام بھیجیں گے۔ میں چلا جاؤں گا۔ وہ اسٹیشن پر ہی ہیں۔ اور کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔

ایک جوان دیہاتی نے اونچی آواز میں درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ ہم ابھی مرنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہم جلدی جان جائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے؟ آخر کار یہ ایک ٹرین ہے۔ یہ حکومت کا خزانہ یا مسلح سپاہیوں کو لے کر جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے محافظ ہیں۔ کیا آپ سن نہیں چکے کہ بہت سے لوٹے جا چکے ہیں؟

خاموش ہو جاؤ۔ اس کے باپ نے غصے میں اپنی داڑھی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

جب یہاں بڑے ہیں۔ تمہیں بولنے کی کیا ضرورت ہے؟

میں تو صرف..........؟

بہت ہو گیا۔ باپ نے سختی سے کہا۔ کچھ دیر کیلئے کوئی بھی نہیں بولا۔

میں سن چکا ہوں۔ امام بخش نے آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے داڑھی کو کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ کہ ٹرین کے ساتھ بہت سے واقعات مشہور ہو چکے ہیں۔

لفظ واقعات نے اپنے سننے والوں کو بے چین کر دیا۔

ہاں۔ بہت سے واقعات سنے جا چکے ہیں۔ میت سنگھ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

ہمیں صرف اللہ سے رحم مانگنا چاہیے۔ امام بخش نے اپنے شروع کئے گئے موضوع کو بند کرتے ہوئے کہا۔

میت سنگھ نے بغیر اپنی اہمیت جتائے ہوئے دعا کرتے ہوئے کہا۔ وائے گورو۔ وائے گورو۔

وہ خاموشی سے بیٹھے رہنے کے دوران جمائیاں لیتے رہے اور بڑبڑاتے رہے۔

یا اللہ اور وائے گورو وائے گورو۔

بہت سے لوگوں نے اپنے سر پر بندھی پگڑی کے کپڑے کو فرش پر بچھا دیا اور سونے کیلئے لیٹ گئے۔

اچانک ایک پولیس والا گوودوارے کے دروازے سے آتا دکھائی دیا۔ نمبردار اور تین چار دیہاتی کھڑے ہو گئے۔ لوگ جو سو رہے تھے انہیں جگانے کیلئے ہلایا گیا۔ وہ جو اونگھ رہے تھے۔ اونگھ سے اٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔ کیا ہوا ہے؟ کیا ہوا؟ وہ جلدی جلدی پگڑی کو اپنے سر پر باندھنے لگے۔

گاؤں کا نمبردار کون ہے؟

بانتا سنگھ دروازے کی طرف بڑھا۔ سپاہی اسے ایک طرف لے گیا۔ اور کچھ

سرگوشیاں کرنے لگے۔ اس کے بعد بانتا سنگھ واپس مڑا۔ اس نے زور سے کہا۔ جلدی کرو۔ ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر دو ملٹری ٹرک اسٹیشن کی طرف انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں وہیں ہوں گا۔

سپاہی تیزی سے باہر چلا گیا۔ دیہاتیوں کا ہجوم بانتا سنگھ کے گرد جمع ہو گیا۔ اس کی آواز میں ایک اتھارٹی کا لہجہ تھا۔

ہر کوئی اپنے گھر کی تمام لکڑیاں اکٹھی کرے اور مٹی کا تیل جو فالتو پڑا ہو یہ سب چیزیں اسٹیشن کی طرف موٹر ٹرک کے پاس لے آئے۔ لوگوں کو اس کے پیسے دیدیئے جائیں گے۔

گاؤں والوں کو اس بات کا انتظار تھا کہ وہ انہیں بتائیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ لیکن سپاہی نے اکھڑ پن سے انہیں حکم دیا۔ کیا تم بہرے ہو؟ کیا تم سن نہیں چکے یا تم چاہتے ہو کہ پولیس والے تمہارے کولہوں پر ماریں تب چلو گے؟ جلدی ساتھ آؤ۔

لوگ منتشر ہو کر گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ نمبردار اپنے گھر چلا گیا۔

کچھ منٹ بھی گاؤں والے لکڑیوں کے گھٹے اور مٹی کے تیل کی بوتلیں گاؤں سے باہر اسٹیشن کی طرف جمع کرنے لگے۔ دو بڑے گدلے سبز ٹرک اور دوسرے ٹرک ایک دوسرے کے قریب آ کر رکے۔ خالی پٹرول کے ڈبوں کی ایک قطار مٹی کی دیوار کے مخالف کھڑی تھی۔ ایک سکھ سپاہی اسٹین گن کے ساتھ نگہبانی کی خاطر کھڑا تھا۔ ایک اور سکھ آفیسر جس کی داڑھی بڑی صفائی سے ایک جالی میں لپٹی ہوئی تھی ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں بیٹھا اپنی ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ وہ لکڑیوں کو دیکھ رہا تھا جو کہ ایک ٹرک میں ڈھیر کی جا رہی تھیں۔ اور سر ہلا کر گاؤں والوں کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔

نمبردار اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ گاؤں والوں کے نام لکھ رہا تھا اور جو کچھ وہ لا رہے تھے اس کی تعداد لکھ رہا تھا لکڑیوں کے بنڈل ٹرک میں ڈھیر کرنے کے بعد اور مٹی کا تیل پٹرول کے ڈبوں میں ڈال کر خالی بوتلوں کو گاؤں والے گروپ کی صورت میں مل کر

اکٹھے کر رہے تھے۔

امام بخش نے لکڑیاں ٹرک میں ڈالیں جو کہ وہ اپنے سر پر اٹھا کے لایا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل نمبردار کو تھما دی۔

اس نے اپنی پگڑی کو دوبارہ باندھا اور افسر کو زور سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ سلام سردار صاحب!

افسر دور دیکھنے لگا۔ امام بخش دوبارہ شروع ہو گیا۔

سب کچھ ٹھیک ہے۔ کوئی خاص بات تو نہیں سردار صاحب!

اس کی بات سن کر وہ آفیسر اچانک مڑا اور غصے سے دانت پیس کر بولا۔ ساتھ جاؤ۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ میں مصروف ہوں؟

امام بخش اپنی پگڑی کو درست کرتے ہوئے انکساری سے گاؤں والوں کے ساتھ مل گیا۔

جب دونوں ٹرک بھر گئے تو آفیسر نے بانتا سنگھ سے کہا کہ تم اگلی صبح پیسے لینے کیلئے کیمپ آ جانا۔ ٹرک اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

بانتا سنگھ اپنے سرگرم دیہاتیوں کے ساتھ گھومنے لگا۔ اسے احساس تھا کہ امام بخش کے بے عزتی کا کسی حد تک وہ بھی ذمے دار تھا۔ گاؤں والے بہت بے صبرے ہو رہے تھے۔

او نمبردار۔ تم کون ہوتے ہو۔ ہمیں بھی کچھ بتاؤ؟

یہ سب چیزیں جو تم نے اکٹھی کی ہیں اتنی بڑی تعداد میں یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟

تم یہ سوچتے دکھائی دے رہے ہو کہ تم ایک اہم شخصیت بن چکے ہو اور ہم سے مزید بات کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ میت سنگھ نے غصے میں کہا۔

نہیں۔ بھائی نہیں۔ اگر میں جانتا تو تم لوگوں کو کیوں نہ بتاتا؟ تم بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔

میں بھلا۔ پولیس والوں اور سپاہیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں۔ انہوں نے

مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ خنزیر کے بچے کس طرح چچا امام بخش سے بات کر رہے تھے۔

اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میں اپنی پگڑی ان کے قدموں میں رکھ کر اپنی بے عزتی خود کیوں کراؤں؟ امام بخش نے بڑی خوبصورتی سے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ نمبردار ٹھیک کہتا ہے۔ اگر تم کسی سے بات کرو اور وہ آگے سے بھونکے تو بہتر ہے کہ چپ رہا جائے۔ چلو ہم سب اپنے گھر چلتے ہیں۔ تم لوگ اپنی چھتوں سے دیکھ سکتے ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

گاؤں والے اپنی اپنی چھتوں پر چڑھنے کیلئے بکھر گئے۔ گھروں کی چھتوں سے اسٹیشن کے قریب کیمپ میں موجود ٹرک با آسانی دیکھے جا سکتے تھے۔

تمام دوپہر گاؤں والے اپنی چھتوں پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے چیخ چیخ کر پوچھتے رہے کہ آیا کسی نے کچھ دیکھا ہے۔ اپنے اس جوش میں وہ دوپہر کا کھانا پکانا بھی بھول گئے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو ایک دن پہلے کا باسی کھانا کھلا دیا۔ ان کے پاس اتنا ٹائم بھی نہیں تھا کہ وہ اپنا چولہا جلائیں۔

آدمیوں نے اپنے مویشیوں کو چارہ نہیں دیا۔ یہاں تک کہ شام ڈھلے تک انہیں دودھ دھونا بھی یاد نہیں رہا۔

جب سورج پل کی محرابوں کے نیچے تک آ گیا تب کہیں جا کے سب کو ہوش آیا کہ انہوں نے اپنے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ کھیتی کا کام بھی نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد اندھیرا چھا جائے گا اور بچے کھانے کیلئے شور مچائیں گے۔

لیکن سب کی نگاہیں مسلسل اسٹیشن پر جمی ہوئی تھی۔ گائے اور بھینسیں اپنے باڑے میں آوازیں نکال رہی تھیں مرد ان جانوروں کی آوازوں سے بے نیاز چھت پر مستقل کھڑے اسٹیشن کی طرف دیکھتے رہے۔ ہر کسی کو امید تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور کوئی اس واقعہ سے بے خبر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

سورج پل کے پیچھے ڈوبنے لگا۔ آسمان پر چھائے ہوئے سفید بادل مالٹئی اور تانبے کے رنگ میں تبدیل ہو گئے۔ جب سرمئی سائے تمتمانے لگے تو جیسے شام نے

اندھیری رات کو آنے کا راستہ دیا ہو۔ اسٹیشن کالی دیواروں میں بدل گیا۔ تھک ہار کر مرد اور عورتیں نیچے اپنے صحن میں آ گئے۔ وہ کام کیلئے ایک دوسرے کو اشارہ کرتے رہے۔

شمالی افق جو کہ سرمئی نیلاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی دوبارہ مالٹئی ہو گیا۔ اور نج تانبے کے رنگ میں اور پھر شعلے کی سرخ لو پورے کالے آسمان پر پھیل گئی۔ گاؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ اپنے ساتھ جلتے ہوئے مٹی کے تیل اور لکڑی کی خوشبو بھی لے آئی۔ گاؤں میں موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی بھی کسی سے نہیں پوچھ رہا تھا کہ ادھر کیا تھا۔ وہاں کیا جلایا گیا؟ وہ سب جانتے تھے۔ وہ اس کو پہلے سے جانتے تھے۔ حقیقت میں پکا جواب یہی تھا کہ ایک ٹرین پاکستان سے آئی تھی۔ منو مجرا کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ایسی شام آئی کہ امام بخش کی اذان کی بلند آواز نہیں ابھری۔

ریسٹ ہاؤس میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حکم چند صبح سے باہر نہیں نکلا تھا۔ جب اس کا خدمتگار دوپہر میں اسٹیشن سے چائے کا تھرماس اور سینڈوچ لے کر آیا تو اس نے اپنے خدمتگار اور خاکروب کو ٹرین کے بارے میں بتایا۔ شام کو نوکروں اور ان کے اہل خانہ نے درختوں کی قطار میں سے شعلے اٹھتے دیکھے۔

دن بھر کے کام نے حکم چند کو بہت تھکا دیا۔ اس کی تھکن جسمانی نہیں تھی۔ بہت سی اموات کو دیکھ کر اس کا جسم سن ہو گیا تھا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر اس کے تمام جذبات مر گئے تھے اور وہ مردوں اور عورتوں کی لاشیں دیکھ رہا تھا اس چھوٹی سے دلچسپی کے ساتھ کہ آیا ان کے پاس ٹرنک اور بسترے تھے۔ لیکن شام سے ہی اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا اور اسے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔ جب وہ کار سے باہر آیا تو بہت تھکا ہوا اور منہ لٹکائے ہوا تھا۔ خدمتگار خاکروب اور ان کے اہل خانہ چھتوں پر چڑھے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ اسے ان کا انتظار کرنا پڑا کہ وہ نیچے آئیں اور دروازہ کھولیں۔ اس کا باتھ روم بھی تیار نہیں تھا۔ حکم چند نے اس نظر اندازی کو محسوس کیا تو اور بھی پریشان ہو گیا۔ وہ نوکروں کی توجہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ ایک نوکر اچانک آیا اور اس کے جوتے اتارنے لگا اور اس کے پاؤں کو رگڑنے لگا۔ ایک پانی کی بالٹی کو بھر کے لایا اور ٹب کو بھر دیا۔ مجسٹریٹ صاحب اچانک اٹھے اور نوکر کو دھکا دیتے ہوئے اور باتھ روم میں گھس

گئے۔

نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد حکم چند کو کچھ تازگی کا احساس ہوا پنکھے کی ہوا ٹھنڈی تھی اور تسکین پہنچا رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ لیٹ گیا۔ اندھیرے میں اس کی بند آنکھوں کے سامنے دن بھر کے مناظر گھومنے لگے۔ اس نے اپنی انگلیوں سے آنکھوں کو دبا کر انہیں فراموش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ منظر اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔

ایک آدمی اپنی چھوٹی آنت پکڑے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں ایک تاثر لئے ہوئے جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھو میں نے کیا حاصل کیا ہے؟ وہاں کونے میں عورتوں اور بچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھٹیں ہوئی تھیں۔

ان کے منہ کھلے کے کھلے تھے کہ جیسے اگر ان کی چیخ نکلی تو ان کی آواز ختم ہو جائے گی۔ ان میں سے کچھ کے جسم پر زخم کے نشان نہ تھے۔ خالی کھڑکیوں میں سے خوف کی چیزیں دیکھو۔ جہاں سے گولیاں نیزے، برچھیاں آئیں تھیں۔ لیٹرینیں جوان آدمیوں کی لاشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ فلش سے اٹھتی ہوئی پاخانے اور پیشاب کی گندی غلیظ بدبو تے کا باعث بن رہی تھی۔ اتنی گہری سوچ سے حکم چند کے منہ میں تے آ گئی۔ سب سے واضح تصویر وہ تھی کہ ایک بوڑھا کسان سفید لمبی داڑھی کے ساتھ جیسے بالکل بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ سامان سفر رکھنے والے خانے میں بندھے ہوئے بستروں کے درمیان بیٹھا تھا اور اپنے نیچے ہونے والے مناظر کو دیکھ کر سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک پتلی سی جمے ہوئے خون کی لکیر اس کے کان سے داڑھی تک بہتی آ رہی تھی۔ حکم چند نے اسے کاندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

بابا۔ بابا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ عجیب طرح سے پھیل گئے اور مجسٹریٹ کا دایاں پاؤں پکڑ لیا۔ میٹھی سی ٹھنڈک حکم چند کے پورے جسم پر طاری ہو گئی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن صرف اپنا منہ کھول سکا۔ ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے ٹخنے سے پنڈلی اور پنڈلی سے گھٹنے تک مضبوطی سے پکڑتے ہوئے چلتے گئے۔ حکم چند نے دوبارہ چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز گلے میں ہی

پھنس گئی۔ ہاتھ مسلسل اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے۔ جب اس نے اس کی ران کے موٹے حصے کو چھوا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ حکم چند نے کراہنا شروع کیا اور آخری کوشش کرتے ہوئے چیخ مار کر ذہنی کوفت پہنچائی۔ وہ اپنی آنکھوں میں دہشت لئے بیٹھا ہوا تھا۔ خدمتگار جو کہ اس کے ساتھ کھڑا تھا وہ بھی خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ صاحب تھک گئے ہیں اور اپنے پاؤں دبوانا پسند کریں گے۔

حکم چند کچھ نہیں بولا۔ اس نے اپنی پیشانی صاف کی اور تکیہ لگا کر بیٹھتے ہوئے چیخنے لگا۔ ہائے رام۔ ہائے رام۔

گھبراہٹ بڑھتے بڑھتے خوف میں تبدیل ہوگئی۔ وہ کمزور اور بیوقوف لگ رہا تھا کچھ دیر بعد تسکین کا ایک احساس اس پر طاری ہوگیا۔ میرے لئے تھوڑی شراب لاؤ۔

خدمتگار ٹرے میں شراب۔ سوڈا اور ایک گلاس لے آیا۔ حکم چند نے شراب سے گلاس کو آدھا بھرا۔ خدمتگار نے باقی گلاس سوڈے سے بھر دیا۔ مجسٹریٹ نے ایک ہی گھونٹ میں آدھا گلاس پی لیا اور واپس لیٹ گیا۔ شراب کو پیتے ہی اس کی گھبراہٹ میں اور اضافہ ہوگیا' نوکر نے دوبارہ سے اس کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ وہ چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ سکون کا احساس ہوا اور پھر خوشگوار تھکن کا۔

خاکروب نے کمروں میں چراغ جلانے شروع کر دیئے۔ اس نے حکم چند کے بستر کے ساتھ ایک میز رکھ دی۔ ایک پتنگا چمنی کے اردگرد پھڑ پھڑانے لگا اور مخروطی چکر کاٹتا ہوا اوپر چھت کی طرف اڑ گیا چھپکلیاں دیوار کے پرے سے بہت تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ پتنگے چھت سے ٹکرا کر چھپکلیوں کی پہنچ سے باہر نکل گئے۔ اور لیمپ کے اردگرد دوبارہ چکر کاٹنے لگے۔ چھپکلیاں اپنی چمکدار کالی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی تھیں۔ پتنگا کبھی اوپر اڑتا اور پھر دوبارہ نیچے آ جاتا۔

حکم چند جانتا تھا کہ اگر ایک سیکنڈ کیلئے بھی چھت پر روشنی کر دی جائے تو کوئی ایک چھپکلی ضرور اپنے چھوٹے سے مگرمچھ جیسے جبڑے میں اسے دبوچ لے گی۔ شاید یہ اس کی قسمت تھی۔ یہ ہر ایک کی قسمت ہوتی ہے۔ خواہ وہ ہسپتال ہو ٹرین ہو یا کسی رینگنے والے جانور کا جبڑا۔ یہ سب ایک جیسا ہی تھا۔ کوئی تو اکیلا بستر پر مر جاتا ہے اور کسی

دوسرے کو اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک کہ بدبو نہیں پھیل جاتی۔

حکم چند نے اپنے ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ کوئی اپنے ضمیر سے کیسے بچ سکتا ہے۔ اس نے شراب کا ایک اور گھونٹ پیا اور اپنے لیے مزید انڈیل لیا۔

شروع سے حکم چند موت کو دیکھ کر وہم کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایک بچے کی حیثیت سے اس نے اپنی آنٹی کو ایک مرے ہوئے بچے کو پیدا کرنے کے بعد مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس کا سارا نظام تباہ ہوگیا تھا اپنے بچے کے مرنے کے بعد اس کی آنٹی کچھ دن تک فریب نظر کا شکار رہی وہ اپنے ہاتھ بلند کر کے بدحواسی کے عالم میں موت مانگتی۔ وہ خوف سے چیخنے اور دیواروں سے ٹکریں مارنے کی وجہ سے مری۔ یہ مناظر حکم چند کے ذہن سے قطعاً ماؤف نہیں ہوتے تھے۔ جوان ہونے کے بعد اس نے موت کے خوف سے جنگ کی۔ کئی کئی گھنٹے یونیورسٹی کے قریب شمشان گھاٹ کے گراؤنڈ میں بیٹھ کر۔ اس نے غور کیا کہ بوڑھے اور جوانوں کو بڑے بڑے اسٹیچر پر لایا جاتا ان کا ماتم کیا جاتا اور پھر انہیں جلا دیا جاتا۔ شمشان گھاٹ سے واپسی پر وہ خاموش ہو جاتا۔ اور اس پر موت کا خوف طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں اس مسئلے کے حل کا نعم البدل ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اس نے اس کو مہربان' شفیق اور بردبار بنا دیا تھا۔ اس نے اس کو مشکل میں بھی خوش رہنا سکھا دیا تھا اس نے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنے بچوں کی دوری کو برداشت کیا تھا۔ اس نے ایک جاہل اور معمولی شکل وصورت کی بیوی کو بغیر کسی شکایت کے برداشت کیا تھا۔ یہ سب چیزیں اس کے اس یقین کے باعث آئیں کہ موت ہی سچی حقیقت ہے۔

سکون' محبت' مقصد' فخر' شفقت کی یہ سب قدریں نمک کی چٹکی کے برابر تھیں اس نے جو کچھ کیا صاف دل سے کیا۔ اگرچہ وہ تحائف وصول کرتا تھا اور مشکل میں اپنے دوستوں کی مدد کرتا تھا۔ وہ رشوت خور نہیں تھا۔ وہ موقع کی مناسبت سے پارٹیوں میں جاتا تھا جہاں گانے بجانے اور ناچنے کا انتظام ہوتا تھا اور کبھی کبھار جنسی عیاشی کا بھی انتظام ہوتا تھا لیکن وہ غیر اخلاق نہیں تھا۔ اس نے اچھی زندگی گزاری تھی۔ لیکن اس ٹرین کے حادثے میں ہونے والی اموات حکم چند کیلئے بہت زیادہ تھیں۔

اپنے اس فلسفیانہ یقین کے ساتھ کہ موت ناگزیر ہے وہ اس قتل عام کا بدلہ نہ لے سکا۔ اس کی ذہنی وسعت اور اس کے عدم تشدد نے اسے حیران و پریشان کر دیا تھا۔ اس کی انٹی کی تصویر تمام تر دہشت کے ساتھ اسے پھر سے یاد آنا شروع ہو جاتی۔ سخت تکلیف دہ زبان اور منہ سے بہتا خون۔ خلا میں گھورتی ہوئی آنکھیں۔ شراب بھی اسے ان یادوں سے دور لے جانے میں مدد نہیں کر پائی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹ سے کمرہ روشن ہو گیا تھا اور پھر پہلے کی طرح اندھیرا چھا گیا۔ غالباً کار کو گیراج میں رکھا جا چکا تھا حکم چند آنے والی رات سے بہت خوفزدہ تھا۔ وہ سوچنے لگا نوکر جلدی ہی واپس اپنے کوارٹرز میں اپنی عورتوں اور بچوں کے پاس چلے جائیں گے اور وہ بنگلے میں اکیلا رہ جائے گا۔ اپنے خالی کمروں کے ساتھ۔ اس نے خود ہی لوگوں کے بنائے ہوئے وہمات کو ہوا دی۔ نہیں نہیں! اسے ضرور اپنے کسی خدمتگار کو اپنے پاس سلا لینا چاہیے۔ یا برآمدے میں' کیا وہ سوچیں گے کہ حکم چند ڈر گیا ہے۔ اس کے ذہن میں چھا گیا۔ وہ ان سے کہے گا کہ رات کو بھی اسے ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لئے انہیں اس کے قریب ہونا چاہیے۔

''بیرہ''

جی صاحب! خدمتگار لوہے کی جالی کے دروازے سے ہوتا ہوا آیا۔

تم نے سونے کیلئے میری چارپائی کہاں بچھائی ہے؟

صاحب! بستر تو ابھی تک نہیں بچھایا۔ آسمان پر بادل ہیں اور رات کو بارش ہو سکتی ہے۔ کیا حضور برآمدے میں سونا پسند کریں گے۔

نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا۔ لڑکا ایک یا دو گھنٹے پنکھا چلا سکتا ہے جب تک کہ کمرہ ٹھنڈا ہو۔ نوکروں سے کہو کہ وہ برآمدے میں سو جائیں۔ رات کو ضروری کام کے سلسلے میں مجھے ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نے آدمی کی طرف بغیر دیکھے مزید کہا۔

اچھا صاحب! اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھروں میں جائیں میں ان سے سختی سے کہہ دوں گا۔ صاحب! کیا میں شام کا کھانا لے آؤں؟ حکم چند کھانے کے متعلق بھول چکا تھا۔

نہیں۔ مجھے کھانے کی کوئی طلب نہیں ہے۔ بس جلدی سے خدمتگاروں سے کہو کہ وہ اپنے بستر برآمدے میں ڈال لیں ڈرائیور سے کہنا کہ وہ بھی یہیں لیٹ جائے۔ اگر برآمدے میں زیادہ جگہ نہیں ہے تو اس سے کہنا کہ دوسرے کمرے میں سو جائے۔

خدمتگار باہر چلا گیا۔ حکم چند کو تسکین کا احساس ہوا اسے اب تحفظ کا سامنا تھا اپنے اردگرد موجود لوگوں کے درمیان وہ بہت سکون سے سو سکے گا اسے انسانوں کی چہل پہل کی ہمت افزاء آوازیں سنائی دیں۔ نوکر برآمدے کی جگہ پر بحث کر رہے تھے کہ آیا۔ بستر اس کے دروازے کے باہر بچھوائے جائیں۔ لیمپ کو دوسرے کمرے میں لایا جائے اور چارپائی بچھانے کی جگہ بنانے کیلئے فرنیچر کو ایک طرف کر دیا جائے۔

کار کی ہیڈ لائٹ نے کمرے کو ایک دفعہ پھر روشن کر دیا۔ کار برآمدے کے باہر ہی رک گئی۔ حکم چند نے مردوں اور عورتوں کی آوازیں سنیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اور لوہے کی جالی کے دروازے میں سے دیکھنے لگا۔

یہ میوزیکل گروپ تھا بوڑھی عورت طوائف لڑکی کے ساتھ تھیں وہ ان کے متعلق بالکل بھول چکا تھا۔

''بہرا!''

جی حضور۔

'' ڈرائیور سے کہو کہ ان موسیقاروں اور بوڑھی عورت کو واپس چھوڑ آئے اور نوکروں کو ان کے کوارٹر میں ہی سونے دو۔ اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں ان کو بلوا لوں گا''، حکم چند نے اپنی اس بیوقوفانہ حرکت کو کافی محسوس کیا۔ نوکر یقیناً اس پر ہنس رہے ہوں گے۔ لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس نے اپنے اندر شراب کا ایک اور گھونٹ انڈیل لیا۔

خدمتگار کے آکر بتانے سے پہلے ہی نوکروں نے باہر جانا شروع کر دیا۔ اگلے کمرے سے لیمپ اٹھا لیا گیا۔

ڈرائیور نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی۔ اس نے بٹن دبا کر ہیڈ لائٹس کو جلایا اور بٹن دبا کر دوبارہ بند کر دیا۔

بوڑھی عورت کار میں نہیں بیٹھ رہی تھی اور اس نے خدمتگار سے بحث شروع کر دی۔ اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ جب تک کہ اس کے دلائل باقی رہے اور کمرے میں بیٹھے مجسٹریٹ کو مخاطب نہ کر لیا۔

خدا آپ کی حکومت ہمیشہ قائم رکھے۔ تمہارا بیٹا سینکڑوں ہزاروں کی قسمت لکھے۔ بوڑھی عورت نے حکم چند کو دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔

حکم چند کو غصہ آ گیا جاؤ۔ وہ چلایا۔ تم نے میرا اگلے دن کا ادھار دینا ہے۔ جاؤ۔ نوکر۔ باہر لے جاؤ اس کو۔

عورت کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ جلدی سے کہنیاں مارتی ہوئی کار میں جا بیٹھی۔

حکم چند کے بستر کے ساتھ رکھے تیل کے لیمپ کی پیلی سی جھلملاتی روشنی کو چھوڑ کر کار باہر چلی گئیں حکم چند اٹھا اور میز اور لیمپ کو اٹھا کر دروازے کے کونے میں رکھ دیا۔ دیوار کی دوسری طرف سے ٹکر مارتے ہوئے پروانے شیشے کی چمنی کے گرد منڈلانے لگے۔ چھپکلیاں چھت سے نیچے دیوار کے اوپر لیمپ کے قریب آ گئیں جیسے ہی کوئی پروانہ دیوار پر اترتا۔ ایک چھپکلی چوری چھپے رینگتے ہوئے پیچھے سے اسے پکڑنے کیلئے جھپٹا مارتی اور پکڑ لیتی یہ اس کے جبڑے میں پھڑ پھڑاتا رہ جاتا۔

حکم چند ان سب کا مشاہدہ بڑی خوش خلقی سے کر رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور دھیرے سے بند ہو گیا۔

ایک چھوٹا کالا سایہ دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی کی ساڑھی پر لگے سلور کے سکے لیمپ کی روشنی میں جگمگا گئے اور سینکڑوں روشنی کے دائرے دیوار اور چھت پر کھیلنے لگے۔ حکم چند گھوما۔ لڑکی اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے اسے کھڑے دیکھتی رہی۔ ہیرا اس کی ناک کے کوکے میں بہت چمک رہا تھا۔ وہ اب بھی خوفزدہ لگ رہی تھی۔

اپنے قریب اس کیلئے جگہ بناتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ آؤ پاس آ جاؤ۔

لڑکی قریب آ گئی اور بستر کے کنارے پر بیٹھ کر باہر دیکھتی رہی۔ حکم چند نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ اس نے اس کی ران اور پیٹ کو ہاتھ سے چھوا اور اس

کی ادھوری سی چھاتی سے کھیلنے لگا۔ وہ بے حس اور بے لوچ بیٹھی رہی حکم چند مزید آگے تک رگڑنے لگا اور غنودگی میں منہ ہی منہ میں کہنے لگا۔

آؤ اور لیٹ جاؤ۔

لڑکی نے اپنے آپ کو مجسٹریٹ کے پاس لیٹا دیا۔ اس کی ساڑھی کے سکوں کی چمک اس کے چہرے پر پڑنے لگی۔ اس نے خس کی خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ جب زمین پر پانی ڈلتا ہے تو اس کی خشک مٹی سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو جیسی خوشبو تھی۔ اس کی سانسوں سے الائچی اور سینے سے شہد کی خوشبو آ رہی تھی۔ حکم چند نے بچوں کی طرح آرام سے اس کے ساتھ ہم بستری کی اور جلدی سو گیا۔

O

مون سون بارش کا دوسرا نام نہیں ہے۔ اس کا اصل عربی نام اشارہ کرتا ہے کہ یہ موسم ہے۔ گرمی کی مون سون اور اسی طرح سردی کی مون سون ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف شمال مغربی گرم ہواؤں کا ہالہ ہوتا ہے جو کہ موسم بناتا ہے۔ سردیوں کی مون سون سردیوں میں بارش برساتی ہے۔ یہ ایک منجمد صبح پر ٹھنڈے برستے فوارے کی مانند ہے۔

اس کے پتے جیسے کسی کو زکام ہو اور وہ تھرتھر کانپ رہا ہو۔ اگرچہ یہ فصلوں کیلئے بہت اچھا ہے۔ لوگ اس کیلئے بہت دعائیں مانگتے ہیں قسمت سے اس کا آخر بہت لمبا نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی مون سون کا کچھ اور ہی معاملہ ہے۔

فروری کے آخری دنوں سے ہی سورج گرم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور موسم بہار گرمیوں کو آنے کیلئے راستہ دے دیتی ہے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ پھر پھولوں کے درخت ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ابتداء میں سارا جنگل سرخ پھولوں میں گھر جاتا ہے۔

موسم بدلتے رہتے ہیں تب درخت بھی اپنے پھول کھو دیتے ہیں۔ ان کے پتے گر جاتے ہیں۔ ان کی خالی شاخیں آسمان کی طرف رخ کر کے پانی کی بھیک مانگتی ہیں۔ لیکن وہاں ذرا بھی پانی نہیں ہوتا۔

سورج پہلے کی نسبت بہت جلدی طلوع ہو جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ بے قرار زمین اپنے ہونٹوں کو گیلا کرے وہ شبنم کے قطروں کو چاٹ جاتا ہے۔ بن بادلوں کا نیلا

آسمان سارا دن خشک کنوؤں' مریوں اور جھیلوں کو دیکھ کر غصے سے بھرا رہتا ہے۔ یہ گھاس اور خاردار جھاڑیوں کو اتنا جھلسا دیتی ہے کہ وہ فوراً آگ پکڑ لیتی ہیں۔ آگ پھیلتی ہے اور خشک جنگل ماچس کی ڈبیہ کی طرح جل جاتا ہے۔ روز بروز مشرق سے مغرب تک بے رحم سورج سب کو جھلساتا رہتا ہے۔ زمین چٹخ جاتی ہے اور اس میں پڑنے والے شگاف منہ کھول کر پانی طلب کرتے ہیں۔ لیکن کہیں پانی نہیں ہوتا۔ دوپہر کو ٹمٹماتی دھند جھیل کے سلور رنگ کو سراب بنا دیتی ہے۔ غریب دیہاتی اپنے مویشیوں کو پانی پلانے کیلئے باہر لے جاتے ہیں۔ اور لگاتار پیاس کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ امیر لوگ سن گلاسز پہن لیتے ہیں۔ اور گرمی سے بچنے کیلئے خش کی بنی ہوئیں چکیں استعمال کرتے ہیں جن کے اوپر ان کے نوکر پانی ڈالتے رہتے ہیں۔ سورج ٹھنڈی ہواؤں سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ یہ ہوا کو اتنا گرماتا ہے کہ وہ لو بن جاتی ہے اور پھر اسے اپنے ٹھکانے پر پیغام پہنچانے کیلئے بھیج دیتا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی میں لو پیار و محبت کے بوسوں کو بدحواس بنا دیتی ہے۔ گرمی دانے نکل آتے ہیں۔ جبکہ لو جسم کو سن کر دیتی ہے جس کی وجہ سے سر اونگھ کی حالت میں ہلتا رہتا ہے۔ اور آنکھیں نیند کی وجہ سے بھاری ہو جاتی ہیں۔ پھر جھوٹی امیدوں کا وقت آتا ہے۔ لو میں کمی آ جاتی ہے۔ ہوا ویسی ہی رہتی ہے۔ شمالی افق سے ایک کالی دیوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں پتنگے اور کوے اس کے آگے اڑتے ہیں ہو سکتا ہے یہ..........؟

نہیں۔

یہ تو مٹی کی آندھی ہے۔ ایک عمدہ پاؤڈر گرنا شروع ہو جاتا ہے ایک سخت ماس ٹڈیوں کا تاحد نظر غول سورج کو چھپا لیتا ہے۔ ٹڈیاں درختوں کے اوپر اور کھیتوں میں موجود ہر چیز بے تحاشا کھا جاتی ہیں۔ پھر انہیں غصے میں جھاڑو سے دروازے کھڑکیاں کھول کر نکالا جاتا ہے۔ زور سے انہیں آگے اور پیچھے سے مارا جاتا اور اسی دوران شیشے کے خانے پاش پاش ہو جاتے۔ چھپر اور لوہے کی چادروں کی چھتیں کاغذ کے ٹکڑے کی مانند جل جاتی ہیں درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے اور بجلی کی تاروں پر گر پڑتے۔

بجلی کی تاروں سے لوگوں کو کرنٹ لگ جاتا اور گھروں میں آگ لگنا شروع ہو جاتی۔ تند و تیز ہوائیں تمام گھروں کو اس آتش کی لپیٹ میں لے لیتیں۔ اور یہ سب کچھ

چند سیکنڈوں میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ چکرواتی گوپال اچاری کہہ سکیں سخت آندھی چلنا شروع ہو جاتی۔ ہوا میں اڑتی ہوئی گرد و مٹی آپ کی کتابوں' فرنیچر اور کھانے پر جم جاتی ہے۔ یہ آپ کی آنکھوں' کان گلے اور ناک میں بھی گھس جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب لوگ نا امید ہو جاتے ہیں۔

وہ وہمی' اداس' پیاسے اور سخت محنتی ہوتے ہیں۔ ان کی گردن کے پچھلے حصے پر نکلے ہوئے گرمی دانے کاغذ کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ ایک اور لوری ہے۔ خوفزدہ کرنے والی خاموشی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تب ہی باریک اور عجیب سی پرندے کی آواز آتی ہے۔ آخر اپنا ٹھنڈا سائے دار ٹھکانہ چھوڑ کر باہر سورج میں کیوں آیا؟

لوگ بڑے جوش سے بے کیف آسمان کو تک رہے تھے۔

ہاں۔ وہاں پر یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ وہ سینہ اور کالے لمبی دموں والے شوخ' کلغی والے بلبلوں کی مانند ہیں وہ خوبصورت کلغی والی کوئل ہیں جو کہ مون سون سے پہلے ہی افریقہ سے اڑ جاتی ہیں۔

کیا تازہ ہوا چلنا شروع ہو گئی ہے؟ اور اس میں نمی کی خوشبو نہیں ہے اور کیا یہ گرج کی آواز نہیں تھی جس میں پرندوں کی دردناک چیخیں ڈوب گئیں۔

لوگ انہیں دیکھنے کیلئے جلدی جلدی چھت کی طرف گئے۔ مشرق سے ایسی ہی آبنوسی دیوار آ رہی ہے۔ بگلوں کا ایک جھنڈ اڑ رہا ہے۔ یہ امید کی ایک کرن ہے جو کہ دن کی روشنی کو چمکا رہی ہے۔

ہوا کالے بادبانی بادلوں سے بھری ہوئی ہے اور وہ سورج کے پار اڑ رہے ہیں۔ گہرے سائے زمین پر پڑ رہے ہیں۔ یہ اور بادلوں کی گرج کی آواز ہے۔ بارش کے بڑے بڑے قطرے گرے اور مٹی میں گر کر خشک ہو گئے۔ بھینی بھینی خوشبو زمین سے اٹھنے لگی۔ ایک اور بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بھوکے شیر کی دھاڑ کی مانند گونجی۔

یہ پانی کے تختے کی مانند لہر در لہر آنے لگی۔ لوگوں نے بادلوں کی طرف اپنے منہ کر لئے اور اپنے منہ کو پانی سے ڈھانکنے لگے۔ اسکول اور دفاتر بند ہو گئے سب کام رک گئے۔

مرد عورتیں اور بچے گلیوں میں پاگلوں کی طرح دوڑنے لگے اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اور چیختے ہوئے۔ ہا۔ ہا۔ ہوں۔ مون سون کے معجزاتی کرامت دیکھ کر۔

مون سون کوئی عام بارشوں کی طرح نہیں ہوتی کہ آئے اور چلی جائے ایک دفعہ جب یہ آ جاتی ہے تو کم از کم دو مہینے یا اس سے کچھ زیادہ دیر رکتی ہے۔ اس کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں پارٹیاں' پکنک کے پروگرام بناتی ہیں۔ خواتین اور بچے درختوں کی شاخوں پر جھولے جھولتے ہیں۔ کھیلنے اور گانے میں اپنا سارا دن گزارتے ہیں۔ مور اپنے پر پھیلاتے ہیں۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اتراتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنی باریک تیز آواز میں چیختے ہیں۔

لیکن کچھ دن بعد پانی کے بہاؤ کی یہ تیزی کم ہو جاتی ہے۔ مٹی دلدل اور کیچڑ بن جاتی ہے۔ کنوئیں اور جھیلیں بھر جاتی ہیں اور اپنی حدوں سے باہر آ جاتی ہیں۔ قصبوں میں گٹر بھر جاتے ہیں اور ان کے پانی سے سڑکیں گدلی ندیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ گاؤں میں جھونپڑیوں کی کچی دیواریں پانی میں مل جاتی ہیں اور گھاس پھوس کی چھتیں خمیدہ ہو جاتی ہیں۔ اور گھر کے مکینوں پر گر جاتی ہیں۔ دریا جو کہ آہستہ آہستہ اوپر کو چڑھتے ہیں جب مون سون کی ہوائیں پہاڑوں پر برستی ہیں تو گرمیوں میں گرمی کی شدت سے برف پگھلنے لگتی ہے اور اچانک سیلاب آ جاتا ہے۔ سڑکیں' ریلوے کی پٹڑیاں اور پل پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ دریا کے بند کے نزدیک واقع گھر پانی کے اس سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔

مون سون کے ساتھ ہی زندگی اور موت کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ تقریباً رات بھر میں گھاس اگ آتی ہے اور بغیر پتوں کے درخت دوبارہ سے ہرے ہو جاتے ہیں۔ سانپ' کنکھجورے۔ بچھو ہر چیز میں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ زمین حشرات الارض' بادامی بھنورے اور چھوٹے مینڈکوں سے بھر جاتی ہے۔ رات میں ان گنت پروانے لیمپ کے اردگرد اڑتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے کھانے اور پانی میں گرتے ہیں۔ چھپکلیاں کیڑے مکوڑے کھاتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بھاری ہو کر چھتوں سے گر جاتی ہیں۔ کمروں میں مچھروں کی گھوں گھوں کی آواز پاگل کر دیتی ہے۔ لوگ کیڑے مار دوا چھڑکتے ہیں اور فرش تڑپتے

ہوئے کیڑوں کے جسموں اور پروں سے بھر جاتا ہے۔ اگلی شام لیمپ کے اردگرد بہت سے پروانے اڑ رہے ہوتے ہیں اور خود کو اس کے شعلے میں جلا رہے ہوتے ہیں۔

مون سون کے آخری حصے میں۔ پھوار خبردار کیے بغیر ہی برستی اور پھر خود ہی رک جاتی ہے۔ بادل اڑتے ہوئے بارش برساتے برساتے ہمالیہ کے پہاڑوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ تب ان میں سے کھینچ کھینچ کر پانی کا آخری قطرہ بھی گر جاتا ہے۔ بادلوں کی گرج چمک کبھی نہیں ختم ہوتی۔ یہ سب کچھ اگست کے آخر اور ستمبر کے شروع ایام تک جاری رہتا ہے۔ تب بارشیں خزاں کو آنے کیلئے راستہ دے دیتی ہیں۔

بادلوں کی گرج نے حکم چند کو جگا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں سرمئی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں ایک تھکا ماندہ شعلہ لیمپ کی چمنی میں جھلملا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کی زوردار آواز بھی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈی خنک ہوا تیزی سے آ جا رہی تھی۔ لیمپ بھڑکا اور بجھ گیا۔ بارش کے قطرے آہستہ آہستہ گرنا شروع ہو گئے۔

بارش! ایک طویل اور آخری بارش' مجسٹریٹ نے سوچا۔

مون سون بھی غریبوں میں سے ایک غریب تھی۔ بادل آ چکے تھے لیکن وہ بہت بلند تھے۔ اور پیاسی زمین کو چھوڑتے ہوئے تیرتے پھر رہے تھے۔ ستمبر بارشوں کا اختتام تھا لیکن یہ اس کا شاندار خیر مقدم کرتا ہے۔ اس کی خوشبو بہت اچھی ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس کا نظارہ بہت اچھا ہے اور بہت کچھ۔ اس کا کام بہت اچھا ہے۔ لیکن اس نے کیا کیا؟

حکم چند بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ لاشیں! سینکڑوں تڑپتی سسکتی جلی کٹی لاشیں جب بارش نے آگ کو بجھایا۔ سو گز تک کٹی ہوئی لاشیں۔

وہ ٹھنڈک اور خوف محسوس کر رہا تھا۔ وہ بستر کی دوسری جانب پہنچا۔ لڑکی جا چکی تھی۔ وہ بنگلے میں تن و تنہا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے اپنی کلائی گھڑی نکالی اور کپ کی صورت میں اپنا ہاتھ ڈائل کے گرد رکھا۔ گھڑی کی چمکتی سوئیوں نے ساڑھے چھ بجے کا

اعلان کیا۔ وہ بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ تب اس نے برآمدے میں کسی کے کھانسنے کی آواز سنی اور اس کے اندیشے دور ہو گئے۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا۔ درد کم ہو گیا۔ اس نے بغیر کچھ کھائے پیئے بہت زیادہ شراب پی لی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول کر کمرے میں اردگرد کا جائزہ لیا اور لڑکی کو دیکھا۔ وہ گئی نہیں تھی۔ وہ ایک بڑی بید کی بازوؤں والی کرسی پر اپنی کالی چمکتے سکوں والی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ حکم چند کو تھوڑی سی حماقت محسوس ہوئی۔ لڑکی وہاں پر دو اور تین راتوں سے تھی۔ اور اتنے دن سے وہ کرسی پر سو رہی تھی۔ وہ اب تک اپنی چھاتیوں کے بھاری پن سے بچی ہوئی تھی۔ وہ خود کو گندا اور بوڑھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس بچی کے ساتھ کیسے کچھ کر سکا اگر اس کی بیٹی زندہ ہوتی تو وہ اسی کی ہم عمر ہوتی۔ اسے ندامت و پشیمانی کا احساس ہوا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ ندامت اور عزم نشہ اترنے کے بعد ختم ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ سے یہی کرتے ہیں۔ اس نے غالباً دوبارہ شراب پی اور دوبارہ اسی لڑکی کے ساتھ سو گیا۔ اور یہ سب کچھ اسے برا لگا تھا۔ یہی زندگی تھی اور یہ بہت افسردہ کن بات تھی۔ وہ آرام سے اٹھا اور اپنی میز پر رکھی ہوئی اٹیچی کو کھولا۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں میں پیلے رنگ کا مواد موجود تھا۔ اس کے بالوں کی جڑیں سفید اور سرمئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے جبڑے میں بہت سے گوشت کے ریشے پھنسے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا اور بدصورت تھا۔ اس نے اپنی زبان باہر نکالی۔ زبان کے پچھلے حصے کے درمیان میں پیلے رنگ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ میز کے اوپر آڑا ترچھا گر گیا۔ وہ اپنی سانسوں کو خود سونگھ سکتا تھا۔ یہ سانسیں لڑکی کیلئے قے آور تھیں۔ یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی کہ لڑکی نے رات غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر گزاری اس نے اینو کی بوتل نکالی اور بہت سے بڑے چائے کے چمچے گلاس میں ڈالے۔ اس نے تھرموس کھول کر پانی نکالا۔ گلاس میں سے نکلتے ہوئے بلبلے میز پر بکھر گئے۔ اس نے گلاس میں اس وقت تک پانی ڈالا جب تک کہ یہ بلبلے ختم نہ ہو گئے۔ پھر اسے جلدی سے پی گیا۔ کچھ دیر کیلئے اس نے

اپنے سر کو اٹھنے کی رغبت دی اور اس کے ہاتھ میز پر ہی دھرے رہے۔

اینو کی اس خوراک نے گڑگڑ کو آرام سے ختم کر دیا۔ اس کے معدے کے نچلے حصے سے ہوا اٹھ کر اس کے گلے تک آئی اور ایک طویل پرسکون ڈکار بن گئی۔ دھڑکن کم ہوئی اور مسلسل رہنے والا درد اس کے سر کے پیچھے منتقل ہو گیا۔ اس نے سوچا گرم گرم تیز چائے کے چند ایک کپ اس کے درد کو ختم کر دیں گے۔ حکم چند نے نوکروں کے کوارٹرز کی طرف کھلنے والے دروازے کو کھول کر اس نے اپنے خدمتگار کو آواز دی۔

شیو کا پانی اور میری چائے لے آؤ۔ یہاں لے آؤ۔ میں اسے اپنے لیے خود ہی بنا لوں گا۔

جب خدمتگار آیا تو حکم چند نے چائے کی ٹرے اور شیو کے گرم پانی کا پیالہ بیڈ روم میں ہی لے لیا۔ اور انہیں میز پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے لیے ایک چائے کا کپ انڈیلا اور اپنی شیو کی تمام چیزیں اٹھا لے گیا۔ اس نے اپنی تھوڑی پر صابن کا جھاگ لگایا اور شیو کی۔ اور اپنی چائے کی چسکی لی۔ چینی اور سلور کے برتنوں کی آوازیں لڑکی کو تنگ نہیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنا منہ کھول کر سو رہی تھی۔ وہ مری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ وقتاً فوقتاً اس کی چھاتی کے اوپر نیچے ہونے والی حرکت اس کے جسم کو بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک تتلی نما گلابی رنگ کا کلپ کرسی کی ٹانگ کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اس کی ساڑھی خراب اور سلوٹ شدہ تھی۔ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے سکے فرش پر چمک رہے تھے۔ حکم چند نے چائے پیتے ہوئے اور شیو کرنے کے دوران لڑکی پر سے نظر نہ ہٹائی۔ وہ اپنے جذبات کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اسے دوبارہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس کے ساتھ سونا چاہے گی وہ اس کے ساتھ سو جائے گا۔ یہ سوچ اس کو بے قرار کر رہی تھی۔ اس نے اب اس کے ساتھ یہ سب کچھ کرنے کیلئے بہت زیادہ شراب پی لی۔

پاؤں کے رگڑنے اور برآمدے سے آنے والی کھانسنے کی آوازیں اس کی سوچ میں مخل ہو رہی تھیں۔ اس کی توجہ کو ہٹانے کیلئے دوبارہ کھانسی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سب انسپکٹر آ گیا ہے۔ حکم چند نے اپنی چائے ختم کی اور اپنے کپڑے اٹھا کر بدلنے

کیلئے باتھ روم چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اس دروازے کی طرف گیا جو کہ کوارٹرز کی طرف کھلتا ہے اور برآمدے میں جاتا ہے۔

سب انسپکٹر اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اپنی کرسی پر سے اٹھا اور سلوٹ کیا۔

کیا بارش میں باہر چہل قدمی کا آپ کا پروگرام ہے؟

نہیں نہیں! میں تو صرف نوکروں کے کوارٹرز کی طرف گیا تھا۔ تم بہت جلدی آ گئے ہو۔ مجھے امید ہے کہ سب ٹھیک ہو گا۔ ان دنوں زندہ رہنے والے کو بہت شکر ادا کرنا چاہیے۔ کہیں بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک کے بعد ایک مصیبت.........؟

مجسٹریٹ نے فوراً لاشوں کے بارے میں سوچا۔

کیا رات میں بارش ہوئی؟ ریلوے اسٹیشن کے پاس کیا ہو رہا ہے؟ میں آج صبح گیا تھا جب ٹرین چھوٹنے والی تھی۔ وہاں پر کچھ زیادہ نہیں بچا ہے صرف راکھ اور ہڈیوں کا ایک بڑا ڈھیر ہے۔ وہاں پر بہت سی کھوپڑیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہم ان کا کیا کریں؟ میں نے نمبردار کو لکھ بھیجا ہے کہ کسی کو بھی پل یا ریلوے اسٹیشن کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ تعداد میں کتنے تھے۔ کیا تم نے گنتی کی؟

نہیں سر۔ سکھ افسر نے کہا ہے وہ تقریباً ہزار کے قریب ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے حساب لگایا ہو گا۔ کہ ایک بوگی میں کتنے لوگ آ سکتے ہیں اور اس کو بوگیوں کی تعداد سے ضرب دیا ہو گا۔ اس نے کہا ہے کہ چار پانچ سو تو صرف چھتوں بوگیوں کے پائیدان اور دوسری جگہوں کے درمیان مارے گئے ہیں۔ جب ان پر حملہ ہوا ہو گا تو وہ ضرور نیچے گر گئے ہوں گے۔ چھتیں جمے ہوئے خون سے بھری ہوئی ہیں۔

ہرے رام۔ ہرے رام۔ پندرہ سو معصوم لوگ کیا عجیب زمانہ ہے؟ زمین پر اندھیر مچی ہوئی ہے۔ سرحد کے نزدیک صرف یہ ایک ہی جگہ بچی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی سب کچھ دوسری جگہوں پر بھی ہو رہا ہو گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب ہمارے لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ان گاؤں میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟

یہی تو میں آپ کو بتانے کیلئے آیا ہوں۔ سر۔

کچھ گاؤں کے مسلمانوں نے پناہ گزین کیمپ کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ چند رنگر خطرناک علاقہ ہونے کی وجہ سے کسی حد تک خالی کرا لیا گیا ہے۔ پاکستانی افواج کو جب بھی کوئی اطلاع دی جاتی ہے وہ ٹرک میں بیٹھ کر اپنے بلوچی اور پٹھان سپاہیوں کے ساتھ انہیں اٹھوا لیتے ہیں۔ لیکن منوں مجرا کے مسلمان اب بھی وہیں ہیں اور آج صبح نمبردار نے رپورٹ کی ہے کہ چالیس یا پچاس سکھ پناہ گزین پہنچے ہیں جو کہ پایاب مقام سے دریا عبور کر رہے تھے۔ انہیں مندر میں رکھا گیا ہے۔

انہیں رکنے کی اجازت کیوں دی تھی؟ حکم چند نے سخت لہجے میں کہا تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ آرڈر یہ جاری ہوا ہے کہ تمام آنے والے پناہ گزینوں کو جالندھر کیمپ پہنچایا جائے۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ سکھ منوں مجرا میں بھی قتل عام شروع کر سکتے ہیں۔

نہیں سر۔ اب تک صورت حال ہمارے قابو میں ہے۔ پاکستان میں ان مہاجروں کا زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ راستے میں کوئی بھی انہیں جان بوجھ کے نہیں چھیڑے گا۔ منوں مجرا کے مسلمان ان کیلئے مندر میں کھانا لاتے رہے ہیں۔ یہاں کون قتل عام کرے گا اور کون اپنے تعلقات خراب کرے گا۔ جبکہ یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ مجھے دریا عبور کرنے کے بارے میں کوئی خیال نہیں تھا۔ عموماً بارشوں کے بعد دریا میلوں میں پھیل جاتے ہیں اور نومبر یا دسمبر تک وہاں کوئی پایاب مقام نہیں ہوتا۔ اس سال تو مشکل سے ایک آدھ بارش ہوئی ہے۔ وہاں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں سے لوگ دریا پار کر سکتے ہیں۔ اور دریا کے کنارے ڈیوٹی دینے کیلئے میرے پاس زیادہ پولیس والے نہیں ہیں۔

حکم چند نے ریسٹ ہاؤس کے گراؤنڈ کے پار دیکھا بارش مسلسل جاری تھی۔ چھوٹے چھوٹے سوراخ بڑھے گڑھوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ آسمان پر اب تک سرمئی بادل پھیلے ہوئے تھے۔

یقیناً' اگر بارش جاری رہی تو دریا بھر جائیں گے۔ اور دریا پار کرنے زیادہ خشک مقام نہیں ہوں گے۔ ایک آدمی بھی پل کے اوپر مہاجرین کی حرکات کو قابو کرنے کیلئے کافی

ہو گا۔

بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج نے بارش کی رفتار کو اور بڑھادیا۔ ہوا اپنے ساتھ برآمدے میں پھوار لا رہی تھی۔

لیکن ہمیں اس علاقے سے مسلمانوں کو نکالنا ہو گا۔ چاہے وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ جتنی جلدی انہیں نکالا جائے اتنا اچھا ہو گا۔

گفتگو کے دوران ایک طویل وقفہ آ گیا۔ دونوں آدمی بیٹھے بارش کو گھور رہے تھے۔ حکم چند نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

جب طوفان آتے ہیں تو اس کے سامنے کسی ایک کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس لمبی گھاس کو دیکھو۔ ٹھنڈی ہواؤں کے سامنے اس کے پتے مڑ جاتے ہیں جبکہ اس کا تنا تختی سے اپنے غرور میں کھڑا رہتا ہے۔ جب طوفان آتے ہیں تو یہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے سفید شاتول ہوا سے گوکھرد کے روئیں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولا عقلمند آدمی دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا ہے اور ہمیشہ پار اتارتا ہے۔

سب انسپکٹر اس فرسودہ سچ کو بڑی شائستگی سے سن رہا تھا۔ وہ اپنے فوری حل طلب مسائل کی وجہ سے ان کے معنی ومفہوم کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ حکم چند نے پولیس افسر کے سپاٹ چہرے کا نوٹس لیا۔ اس نے صاف اور واضح الفاظ میں پوچھنا شروع کر دیا۔

تم رام لال کے قتل کے حوالے سے کیا کچھ کر چکے ہو؟ کیا تم نے مزید کسی اور کو گرفتار کیا ہے؟

ہاں سر۔ جگا بدمعاش نے ہمیں کل کچھ نام بتائے تھے۔ یہ وہ آدمی ہیں جو کبھی اس کے اپنے گروپ میں شامل تھے۔ کپور گاؤں کے رہنے والے مالی اور اس کے چار ساتھی۔ کپور گاؤں دریا سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن جگا ان کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے آج صبح چند کانسٹیبل ان کی گرفتاری کیلئے کپور گاؤں بھیجے ہیں۔

حکم چند کو سب انسپکٹر کی بات میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی۔ اس نے تو دور کہیں اپنی نظریں گاڑھی ہوئی تھیں۔

ہم جگا اور اس کے ساتھی دونوں کے بارے میں غلط سمجھ رہے تھے۔ سب انسپکٹر

نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے آپ کو جگا کے ایک جولاہے کی مسلمان بیٹی سے تعلقات کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے اکثر راتوں کو مصروف رکھتی ہے۔ مالی نے ڈاکہ ڈالنے کے بعد چوڑیاں جگا کے صحن میں پھینکی تھیں۔

حکم چند اب تک باہر دیکھ رہا تھا۔

اگر آپ کی اجازت ہو تو مالی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد ہم جگا اور اقبال کو رہا کر دیں۔

مالی اور اس کے ساتھی کون ہیں؟ سکھ یا مسلمان، حکم چند نے دفعتہً پوچھا

سب سکھ ہیں۔

مجسٹریٹ پہلے کی طرح دوبارہ اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اگر وہ مسلمان ہوتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ معلومات کے مطابق۔ تحریک میں حصہ لینے والے سکھ اتحادی منوں مجرا کے سکھوں کو اس بات پر قائل کریں گے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو جانے کی اجازت دے دیں۔

ایکدفعہ پھر طویل خاموشی کا چھاگئی۔ سب انسپکٹر کے دماغ میں پلان اپنے پر پرزے کھول رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی رائے دیئے اٹھ کھڑا ہوا۔ حکم چند کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ سنو! اس نے کہا۔ مالی اور اس کے گینگ کو بغیر کسی اندراج کے چھوڑ دینا۔ لیکن ان کی حرکات پر نظر رکھنا۔ ہم جب چاہیں گے انہیں گرفتار کر لیں گے۔ لیکن بدمعاش اور اس بھلے مانس کو ابھی رہا نہ کرو۔ ہمیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

سب انسپکٹر نے واپس جانے کیلئے مجسٹریٹ حکم چند کو سلیوٹ کیا۔

ٹھہرو میں نے ابھی بات ختم نہیں کی ہے۔ حکم چند نے اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ اپنے ضروری کام کرنے کے بعد مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپ کے کمانڈر کو پیغام بھیج دینا کہ ٹرک بھیج کر منوں مجرا کے مسلمانوں کو اس خطرناک علاقے سے نکال لیں۔

سب انسپکٹر نے ایک بار پھر سلیوٹ کیا۔

حکم چند اس پر اعتماد کرنے کے بعد پھانسی اور دوسرے پیچیدہ منصوبوں کے

بارے میں اسے صلاح دیتا رہتا تھا۔ سب انسپکٹر نے اپنی برساتی پہن لی۔ اسے برساتی پہنتا دیکھ کر حکم چند بولا۔ میں تم کو اس بارش میں جانے کی اجازت نہ دیتا لیکن معاملہ اتنا پیچیدہ ہے کہ تمہیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ حکم چند نے مسلسل زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں جانتا ہوں۔ سر۔ سب انسپکٹر نے دوبارہ سلیوٹ کیا۔

میں فوراً ہی کوئی ایکشن لوں گا۔

اس نے اپنی بائیسکل نکالی اور اس پر سوار ہو کر ریسٹ ہاؤس سے دور ہوتا ہوا کچے راستے پر چڑھ گیا۔

حکم چند برآمدے میں بیٹھ کر احمقوں کی طرح آسمان سے گرتے ہوئے بارش کے قطروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی غلط اور درست ہدایات کا اس پر کسی بھی قسم کا بوجھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجسٹریٹ تھا کوئی عیسائی مبلغ نہیں۔ یہ روز روز کے مسائل تھے جن کا اسے حل نکالنا ہوتا تھا۔ اسے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ انہیں نامعلوم سٹینڈرڈ کے برابر درجہ دے۔ اس کی زندگی میں بہت زیادہ چاہیے ضرور چاہیے۔ کے الفاظ نہیں تھے۔ اس کیلئے تو بس جو ہے سو ہے۔ زندگی کا حاصل تھا۔ اس نے زندگی کو اسی طرح لیا جس طرح کی وہ تھی۔ وہ اسے نئے سرے سے بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ یا اس کے خلاف بغاوت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاریخ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انسانوں نے ہمیشہ خواہی نخواہی میں حصے داری کی ہے۔ اسے یقین تھا کہ جو انفرادی طور پر باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں اس کے فوری انجام کو بھی دیکھنا چاہیے جیسے کہ زندگی کی حفاظت خود کو خطرات میں ڈال کر۔ معاشرتی ڈھانچے میں ڈھل کر اور اجتماع میں بلا معاوضہ بولتے وقت بھی کرنی چاہیے۔

اس کا فوری حل طلب مسئلہ مسلمانوں کی زندگی کی حفاظت کرنا تھا۔ وہ جس طرح بھی کر سکے گا یہ کرے گا۔ چاہے اس نے آج تک تاعون کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ دو آدمی جو کہ اس کی اجازت سے گرفتار کئے گئے کسی بھی کیس میں گرفتار ہو جانے چاہئیں تھیں ان میں سے ایک اتحادی اور دوسرا ایک برے کردار کا مالک شخص تھا۔ مشکل وقت میں یہ ضروری تھا کہ انہیں پکڑے رکھا جائے۔ اگر اس نے اس معاملے کو معمولی سمجھ کر غفلت کی تو اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ اور پھر حقیقت میں اس غلطی کو بڑی

غلطی کہا جائے گا۔

حکم چند نے فخر محسوس کیا اگر اس کا منصوبہ کارگزاری کے قابل ہوا۔ اگر وہ صرف خود اپنے لیے ہی تمام معلومات چاہے تو کوئی بھی تحریری ثبوت نہیں ہے۔

اس کا ماتحت عہدیدار اس کے ذہن کو سمجھ نہیں پایا اور اس کو پیچیدہ صورت حال میں ڈال گیا۔

ریسٹ ہاؤس کے اندر سے باتھ روم کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

حکم چند اٹھا اور اس نے چیخ کر خدمتگار کو ناشتہ لانے کیلئے کہا۔

لڑکی اپنی تھوڑی ہاتھوں میں رکھے بستر کے ایک کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔ حکم چند کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے سر کو ڈھانپ لیا۔ جب حکم چند کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ بھی اپنی نظریں فرش پر گاڑھے دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد حکم چند نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

تم ضرور بھوکی ہو گی میں نے تمہارے لئے چائے منگوائی ہے۔

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں اس پر ڈالیں ”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ ”پہلے کچھ کھا لو پھر میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا کہ تمہیں گھر لے جائے۔ تم کہاں رہتی ہو؟“

چندن نگر۔ جہاں انسپکٹر صاحب کا پولیس اسٹیشن ہے۔

پھر ایک طویل وقفہ ہو گیا۔ حکم چند نے دوبارہ اپنا گلہ صاف کیا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

حسینہ۔ حسینہ بیگم۔

حسینہ۔ تم حسین ہو۔ تمہاری ماں نے تمہارا اچھا نام رکھا ہے۔ کیا وہ بوڑھی عورت تمہاری ماں ہے؟

لڑکی پہلی دفعہ مسکرائی۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کی باتیں اتنے شوق سے نہیں سنی تھیں۔ اب تو سرکار خود اسے خوبصورت کہہ رہے تھے اور اس کے خاندان میں دلچسپی لے رہے تھے۔

نہیں سر۔ وہ میری دادی اماں ہے۔ میرے پیدا ہونے کے فوراً بعد ہی میری ماں مرگئی تھی۔

تمہاری عمر کتنی ہے؟

میں نہیں جانتی۔ سولہ یا سترہ۔ شاید اٹھارہ۔ میں پڑھی لکھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنی تاریخ پیدائش کا ریکارڈ نہ رکھ سکی۔ اپنی اس مضحکہ خیز بات پر وہ خود بھی مسکرا دی۔

اسے مسکراتا دیکھ کر مجسٹریٹ بھی مسکرا دیا۔ خدمتگار ایک ٹرے میں چائے۔ ٹوس اور انڈے لے آیا۔

لڑکی چائے کے کپ درست کرنے کیلئے اٹھی۔ اس نے ایک مکھن لگا ٹوس پرچ میں رکھا اور اسے میز پر حکم چند کے سامنے رکھ دیا۔

میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ میں چائے پی چکا ہوں۔

اگر آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔ حسینہ نے بھی جھوٹ موٹ کی ناراضگی دکھاتے ہوئے کہا اور وہ چاقو دور رکھ دیا جس سے وہ ٹوس پر مکھن لگا رہی تھی۔ حسینہ بستر پر بیٹھ گئی۔

یہ دیکھ کر مجسٹریٹ خوش ہو گیا۔ اچھا مجھ سے ناراض نہ ہو۔ اس نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف آیا اور اس کے کندھوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

تمہیں ضرور کھانا چاہیے تم نے پچھلی رات سے کچھ نہیں کھایا۔

لڑکی اس کے بازوؤں میں سے بل کھا کر نکل گئی۔

اگر آپ کھائیں گے تو میں بھی کھاؤں گی۔ اگر آپ نہیں کھاتے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔

ٹھیک ہے۔ اگر تم ضد کرتی ہو تو۔

حکم چند نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھنے میں مدد دی اور اسے میز کی طرف لے آیا۔

ہم دونوں کھائیں گے۔ آؤ اور میرے ساتھ بیٹھو۔

لڑکی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس نے ایک چوڑا

سا مکھن لگا ٹوس اس کے منہ میں ڈالا اور ہنس دی جب اس نے اپنے بھرے ہوئے منہ سے کہا۔

''بہت ہے بہت ہے۔'' اس نے مکھن اس کی مونچھوں پر مل دیا۔

تم اس پیشے میں کب سے ہو؟

کتنا بکواس سوال ہے یہ پوچھنا کہ کیوں! جب سے میں پیدا ہوئی ہوں۔ میری ماں گانا گاتی تھی اور اس کی ماں بھی گانا گاتی تھی۔ اب تک میں یہی جانتی ہوں۔

میرا مطلب گانا گانے سے نہیں۔ دوسری چیزیں۔ حکم چند نے دور دیکھتے ہوئے کہا۔

دوسری چیزوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ لڑکی نے غرور سے کہا۔

ہم پیسے کی خاطر کچھ کرنے کیلئے نہیں جاتے۔ میں ایک سنگر ہوں اور ڈانس کرتی ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ ناچنا اور گانا کیا ہے؟ آپ تو صرف دوسری چیزوں کو جانتے ہیں ایک بوتل شراب کی اور دوسری چیزیں بس یہی سب کچھ حکم چند نے گھبراہٹ میں کھانستے ہوئے اپنا گلا صاف کیا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔

لڑکی ہنس دی اور اپنے ہاتھ مجسٹریٹ کے چہرے پر رکھ دیئے مجسٹریٹ صاحب۔ آپ کا مقصد برائی کرنا تھا۔ لیکن آپ تھکے ہوئے تھے اور ریلوے انجن کی طرح خراٹے لے رہے تھے۔

لڑکی نے ناک سے سانس لیتے ہوئے زور لگایا اور اس کے خراٹوں کی نقل اتارنے لگی۔ وہ اور زور سے ہنس دی۔

حکم چند نے لڑکی کے بال پکڑ کر گھسیٹے۔ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوتی تو وہ بھی سولہ ' سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوتی۔ لیکن اسے اپنے گناہ کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف تکمیل کی ایک غیر واضح سوچ تھی۔ اس نے لڑکی کے ساتھ سونا نہیں چاہا یا اس کے ساتھ پیار کرنا نہیں چاہا اور یہاں تک کہ اس کے ہونٹوں پر بوسہ بھی دینا نہیں چاہا اور اس کے جسم کا احساس بھی نہیں کرنا چاہا تھا۔

وہ اس سے صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر اس کی گود میں سو

جائے۔

آپ اپنی گہری سوچوں میں پھر ڈوب گئے ہیں۔لڑکی نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔ اس نے چائے کا ایک کپ بنایا اور پھر اسے پرچ میں انڈیل دیا۔

تھوڑی چائے پی لی۔ یہ آپ کو سوچنے سے روکے گی۔ اس نے چائے سے بھری پرچ اس کی طرف دھکیلی۔

نہیں۔نہیں۔ میں اپنی چائے پی چکا ہوں۔تم اسے پیو۔ٹھیک ہے۔ میں چائے پی لوں گی اور آپ اپنی سوچیں۔لڑکی نے آواز سے چائے پینی شروع کر دی۔

حسینہ۔اس نے پیار سے نام پکارا۔حسینہ اس نے دوبارہ کہا۔ہاں۔لیکن حسینہ تو صرف میرا نام ہے۔آپ کچھ اور کیوں نہیں کہتے۔

حکم چند نے اس کے ہاتھ سے خالی پرچ لے لی اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس نے لڑکی کو قریب کیا اور اس کا سر اپنے سر سے ٹکرایا۔ اس نے اپنی انگلیاں اس کے سر میں دوڑائیں تم مسلمان ہو؟

ہاں۔ میں مسلمان ہوں۔حسینہ بیگم اور کیا ہو سکتی ہے؟ ایک داڑھی والا سکھ؟

میرے خیال سے چندن نگر کا خطرناک علاقہ مسلمانوں سے خالی کرا لیا گیا ہے۔تم وہاں کیسے رہ رہی ہو؟

بہت سے جا چکے ہیں۔لیکن انسپکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ہم لوگ اس وقت تک رہ سکتے ہیں جب تک کہ وہ جانے کو نہ کہیں۔ اس معاملے میں گانا گانے والا نہ مسلمان ہوتا ہے اور نہ ہی ہندو۔تمام قوموں کے لوگ مجھے سننے کیلئے آتے ہیں۔

کیا چندن نگر میں اور بھی مسلمان ہیں؟

ہاں۔ ہوں۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

آپ انہیں مسلمان ہندو یا سکھ یا اور کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مرد یا عورت۔ ہیجڑوں کی ایک پارٹی اب بھی وہاں رہتی ہے۔ وہ شرما گئی۔

حکم چند نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے پاس رکھ دیا۔

غریب حسینہ پریشان ہو گئی۔

تم مسلمان یا ہندو نہیں ہو لیکن ہیجڑوں کی طرح نہیں کہ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان۔

مجھے تنگ مت کریں۔

میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی شرما رہی تھی۔ مجھے بتاؤ کہ ہیجڑے کیوں چھوڑ دیئے گئے تھے؟

میں آپ کو بتاؤں گی لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھ پر ہنسیں گے نہیں۔

میں وعدہ کرتا ہوں۔

حسینہ جوش میں آ گئی۔

ہندوؤں کے علاقے میں جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہیجڑے قوم کے فرق کے مسائل کے بارے میں سوچے بغیر وہاں گانا گانے چلے جاتے ہیں۔ ہندو اور سکھ۔ انہیں پسند نہیں کرتے۔ایک دن انہیں پکڑ لیا اور انہیں مارنا چاہا کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ وہ بتاتے بتاتے رک گئی۔

کیا ہوا؟

حکم چند نے شوق سے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی اور اپنے ہاتھوں سے اس طرح تالی بجائی جیسے ہیجڑے اپنی انگلیاں چوڑی پھیلا کر بجاتے ہیں۔ وہ اپنی ڈھولکی بجانا شروع ہو جاتے اور اپنی مردانہ آواز میں گاتے اور بہت تیزی سے گول دائرے میں گھومتے یہاں تک کہ ان کی قمیض ہوا میں اڑنے لگتی پھر وہ رک کر ہجوم کے سرداروں سے پوچھتے۔تم لوگ ہمیں دیکھ چکے ہو۔ بتاؤ کہ کیا ہم ہندو ہیں یا مسلمان؟ ان کے سوال پر سارا مجمع ہنسنا شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع سوائے سکھوں کے۔

حکم چند بھی ہنس دیا۔

یہی بہت کچھ نہیں ہے ایک دن سکھ اپنے کرپان کے ساتھ آئے اور انہیں خوفزدہ کر کے کہا۔ ہم تمہیں اس وقت جانے کی اجازت دیتے ہیں لیکن تم چندن نگر سے

ہرصورت میں چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ ایک ہیجڑے نے اپنے ہاتھ سے دوبارہ تالی بجائی اور اپنی انگلیاں سکھ کی داڑھی میں دوڑا کر پوچھا۔ کیوں؟ تم بھی ہماری طرح ہو جاؤ گے۔ اور کیا پیدا ہوتے بچے بھی۔ یہاں تک کہ تمام سکھوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

یہ تو بہت اچھا ہے۔ حکم چند نے کہا۔ تمہیں محتاط رہنا چاہیے حالات بہت خراب ہو رہے ہیں۔ کچھ دن گھر پر ہی رہو۔

میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ ہم بہت سے بڑے لوگوں کو جانتے ہیں اور پھر ایک طاقت ور مجسٹریٹ بھی میری حفاظت کیلئے میرے پاس ہے۔ جب تک وہ یہاں ہے کوئی میرے سر کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ حکم چند بغیر کچھ کہے اپنے ہاتھوں کو لڑکی کے بالوں میں دوڑاتا رہا۔

آپ چاہتے ہیں کہ میں پاکستان چلی جاؤں؟ حسینہ نے سوال کیا۔

حکم چند نے گھسیٹ کر اسے اپنے نزدیک کر لیا۔ بے کل سے گرم جذبات اس پر طاری ہو گئے۔

حسینہ' اس نے اپنا گلا صاف کر کے دوبارہ کہا۔

حسینہ! الفاظ اس کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

حسینہ' حسینہ' میں بہری نہیں ہوں۔ آپ کچھ اور کیوں نہیں کہتے۔

کیا تم آج یہاں رک سکو گی۔ میری خواہش ہے تم ابھی نہ جاؤ اور شاید تم بھی ابھی یہاں سے جانا نہیں چاہتیں۔

آپ یہ سب کچھ کہنا چاہتے تھے؟ اگر آپ مجھے اپنی کار نہیں دیں گے تو میں بارش میں پانچ میل کا سفر نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر آپ مجھ سے گانا سننا چاہتے ہیں یا ایک اور رات یہاں گزروانا چاہتے ہیں تو آپ کو مجھے نوٹوں کا ایک بڑا بنڈل دینا پڑے گا۔

حکم چند مطمئن ہو گیا۔ پیسہ کیا ہے؟ اس نے ڈرامائی انداز میں نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں تو تمہارے لیے زندگی لٹانے کیلئے تیار ہوں۔

o

ایک ہفتے سے اقبال اپنی کوٹھری میں اکیلا تھا۔ اس کے واحد ساتھی اخبارات اور میگزین کا ڈھیر تھے۔ اس کی کوٹھری میں لائٹ نہیں تھی۔ اور نہ ہی اسے لیمپ مہیا کیا گیا تھا۔ وہ سخت گرمی میں لیٹا ہوا رات کو سنائی دی جانے والی خراٹوں' کبھی کبھار بندوق کے چلنے کی آواز اور مزید خراٹوں کی آوازیں سن رہا تھا۔

جب بارش شروع ہوئی تو پولیس اسٹیشن میں ہمیشہ سے زیادہ اداسی چھا گئی۔ وہاں پر دیکھنے کیلئے مسلسل گرتی ہوئی بارش کے سوا اور کچھ نہیں تھا یا کبھی کبھار ایک کانسٹیبل رپورٹ والے کمرے سے قید خانے تک بھاگتا نظر آ جاتا تھا۔

وہاں سننے کیلئے بارش کے گرتے ہوئے قطروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ کی آواز تھی یا کبھی بادلوں کی گھن گرج اور پھر تیز بارش۔

اس نے اپنی ساتھ والی کوٹھری میں جگا کو دیکھا۔ ابتدائی دو شاموں میں چند کانسٹیبل جگا کو اس کی کوٹھری سے باہر لے گئے۔ وہ ایک گھنٹے بعد اسے واپس لے آئے۔ اقبال نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا اور جگا نے بھی کچھ نہیں بتایا لیکن اس کی پولیس والوں کے ساتھ حاضر جوابی اور بھی سوقیانہ پن بن گئی تھی۔ اور پہلے کی نسبت آشنائی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک صبح پانچ آدمیوں کی ایک پارٹی ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لائی گئی۔ جیسے ہی جگا نے انہیں دیکھا اسے غصہ آ گیا اور انہیں گالیاں دینے لگا۔ انہیں جگا سے بچا کر رپورٹ کرنے والے کمرے کے برآمدے میں لایا گیا۔

اقبال حیران تھا کہ یہ نئے قیدی کون تھے؟

گفتگو سننے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ یہ سب سپاری لینے۔ قتل اور لوٹنے والوں میں سے تھے۔ یہاں تک کہ چندن نگر میں جو کہ پولیس اسٹیشن سے چند گز کے فاصلے پر ہے وہاں قتل ہوا تھا۔

اس نے لال سرخ تمتماتی آگ دیکھی تھی اور لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی تھیں لیکن پولیس کوئی گرفتاری عمل میں نہیں لائی تھی یہ قیدی ضرور عام لوگوں میں سے نہیں تھے۔

جب کہ وہ ان کی شکل وصورت سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ جگا ایک کانسٹیبل کے ساتھ اس کی کوٹھری میں آیا۔ اس کی کوٹھری میں تالا نہیں تھا۔ جگا بہت اچھے موڈ میں تھا۔

ست سری کال۔ بابو جی۔ اس نے کہا۔

میں جا رہا ہوں۔ آپ کے قدموں کا نوکر۔

میں کچھ سیکھوں گا ضرور۔

اقبال صاحب! کانسٹیبل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بغیر تالے کی اس کوٹھری نے اس بدمعاش کو سکھایا ہے کہ سیدھے اور تنگ راستے پر کیسے جایا جاتا ہے۔

دور تک آپ کے ساتھ جگا نے کہا۔

بابو جی کا خیال ہے کہ یہ تم اور حکومت ہو جنہوں نے مل کر مجھے بدمعاش بنایا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے! بابو جی؟

اقبال نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے پاؤں فالتو کرسی پر رکھے اور اخبارات کے ڈھیر کو گھورنے لگا۔ جگا نے اقبال کے پاؤں کرسی پر سے ہٹائے اور اپنے سخت ہاتھوں سے انہیں دبانا شروع کر دیا۔

بابو جی! آخر میری قسمت جاگ ہی گئی۔ میں آپ کی خدمت کروں گا اگر آپ مجھے تھوڑی بہت انگلش پڑھا دیں۔ چند ایک جملے تا کہ میں بھی کچھ گٹ مٹ کر سکوں۔

اب اس کوٹھری میں کون قابض ہونے جا رہا ہے؟ جگا اقبال کے پاؤں اور ٹانگیں مسلسل دباتا رہا۔

میں نہیں جانتا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

پولیس والوں نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے رام لال کے قاتلوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ میرے خیال میں انہوں نے تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا اقبال نے کہا۔ مجھے بھی، جگا مسکرایا اپنے سفید دانتوں میں پیلی لائنوں کے ساتھ۔ جب بھی منوں مجرا میں کچھ غلط سوتا ہے تو یہ ہمیشہ مجھے گرفتار کر لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ میں بدمعاش ہوں۔ کیا تم نے رام لال کا قتل نہیں کیا؟

جگا نے دبانا بند کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو پکڑا اور اپنی زبان باہر نکالی۔ توبہ توبہ۔ اپنے گاؤں کے بنیے کا قتل؟

بابو جی! کون انڈے دیتی مرغی کو مارے گا؟ نہ کہ رام لال جس نے مجھے وکیلوں کو دینے کیلئے روپے دیئے تھے جب میرا باپ جیل میں تھا۔ میں ایسی نیچ حرکت کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب آپ کو بھی وہ رہا کر دیں گے۔

پولیس والے ملک کے بادشاہ ہیں۔ جب کبھی انہیں محسوس ہوا وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ اگر وہ مجھے اندر ڈالنا چاہیں گے تو ترپ کی چال چل کر کسی جھوٹے کیس میں بغیر کسی لائسنس کے مجھے اندر کر دیں گے۔ یا بغیر اجازت کے گاؤں سے باہر نکلنے پر پابندی یا کچھ بھی۔

لیکن تم تو اس رات گاؤں سے باہر تھے؟ جگا اپنی کمر دیوار سے لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی گود میں اقبال کے پاؤں اور اس کے تلوے کو ملنے لگا۔

میں گاؤں سے باہر تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی وشرارت چمکنے لگی۔

لیکن میں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ میں تو خود قتل ہوا تھا۔ اقبال اس کے تاثرات کو جانتا تھا۔ وہ مزید انکشافات جاننے کیلئے جگا کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب کوئی ایک موضوع چن لیا جاتا تو جگا کو چپ کرانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اس نے اور بھی زیادہ زور سے اقبال کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔

آپ یورپ میں کئی سال رہ چکے ہیں؟ جگا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

ہاں، کئی سال۔ اقبال نے جواب دیا۔

تب تو بابو جی۔ جگا نے اپنی آواز کو مزید دھیما کرتے ہوئے پوچھا۔ آپ ضرور بہت سی میم عورتوں کے ساتھ سوئے ہوں گے۔ کیوں؟

اقبال اس کے سوالوں سے تنگ آ گیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہندوستانیوں کو جنس باتوں کے موضوع سے دور رکھا جا سکے۔ جنس تو ان کے ذہنوں پر مسلط ہوتی ہے۔ یہ ان کے فنون لطیفہ لٹریچر اور مذہب میں آ چکی ہے۔

کوئی انہیں قانون کی عدالت اور مارکیٹ کی جگہوں پر بھی دیکھ لیتا ہے جہاں

چھابڑی فروش بڑی کامیابی سے مختلف ٹریڈ کے ناموں سے سمندری تیل بیچتے ہیں جو کہ ریت کی چھپکلی کی جلد سے حاصل شدہ ہوتا ہے۔ جنسی شکتی کیلئے اس کے کئی فائدے بتائے جاتے ہیں۔ اس چیز کو عطائی کے اشتہارات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بانجھ پن کے علاج کے ماہر ہیں اور دوائیوں سے بچے دانی کو لڑکا پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایسی باتیں ہر کوئی ہر جگہ سن سکتا ہے۔ لوگ جنسی گالیاں دیتے ہیں تعفریفی کلمات جیسے سالا۔ بیوی کا بھائی۔ اور سسرا۔ بیوی کا باپ اور اکثر ان تعریفی کلمات سے دوستوں اور رشتے داروں کا نوازا جاتا ہے۔ ناراضگی کا تاثر دینے اور دشمن کی بےعزتی کیلئے۔

کسی بھی موضوع پر کی جانے والی گفتگو چاہے سیاست' فلسفہ یا کھیل پر ہو جلد ہی سیکس پر آ جاتی ہے۔ جس سے ہر کوئی کھسیانی ہنسی ہنس کر اور ہاتھ مار مار کر مزے لے لیتا ہے۔

ہاں۔ میں ہم بستری کر چکا ہوں۔ غالباً بہت کے ساتھ اقبال نے کہا۔

واہ واہ۔ جگا نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے زور دار طریقے سے اقبال کے پاؤں دباتے ہوئے تاثر دیا۔ وہ اقبال سے مرعوب ہو رہا تھا۔

واہ بابو جی۔ بہت اچھے آپ نے تو بہت مزے اڑائے ہوں گے۔ میم صاحب تو جنت کی حوروں کی طرح ہوتی ہیں۔ سفید اور نرم جیسے سلک۔ ہمیں تو یہاں سب کالی بھینیس ملتی ہیں۔

عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حقیقت میں گوری عورتیں زیادہ جوشیلی نہیں ہوتیں۔ کیا تم شادی شدہ ہو؟

نہیں بابو جی۔ کون ایک بدمعاش کو اپنی بیٹی دے گا۔ لیکن میں اپنی جنسی خواہش پوری کر چکا ہوں جہاں سے میں کر سکتا تھا۔

کیا تم اسے زیادہ حاصل کرتے ہو؟

کبھی کبھار...... جب میں فیروز پور سننے کیلئے جاتا ہوں اور اگر میرے پاس وکیلوں اور ان کے کلرکوں کو دینے کے بعد پیسے بچ جاتے ہیں تو میرا بہت اچھا وقت ہوتا

ہے۔ میں ساری رات سودے بازی کرتا ہوں۔ عورتیں سمجھتی ہیں کہ دوسرے آدمیوں سے کروانے کا مطلب ہے کہ دو یا زیادہ سے زیادہ تین دفعہ کروا لیں۔ اس نے اپنی مونچھوں کو مروڑا۔ لیکن جب جگت سنگھ ان کو چھوڑتا ہے تو وہ ہائے ہائے چیخ رہی ہوتی ہیں۔ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کہتی ہیں اور خدا کے نام پر مجھ سے بھیک مانگتی ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں اور پیسے واپس لے لوں۔

اقبال جانتا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ بہت سے جوان آدمی ایسی ہی لغو باتیں کرتے ہیں۔

جب تم شادی کر لو گے تو تم اپنے برابر کی بیوی حاصل کر لو گے۔ اقبال نے کہا۔ تم اپنے کان پکڑو گے اور کہتے پھرو گے۔ توبہ' توبہ۔

شادی میں کوئی مزا نہیں۔ بابو جی۔ مزے کرنے کیلئے جگہ اور وقت کہاں ہے؟ گرمیوں میں سب باہر کھلی جگہ پر سوتے ہیں اور جو کچھ آپ کر سکتے ہیں وہ دور پرے ہٹ کر تھوڑی دیر کیلئے ممکن ہے۔ اور جب تک آپ ان سب چیزوں پر قابو پاتے ہیں آپ کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ سردیوں میں مرد اور عورتیں الگ الگ سوتے ہیں۔ آپ قدرت کے جواب کا انتظار کریں کہ کب وہ آپ کو رات میں موقع فراہم کرتی ہے۔

تم تو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ بغیر شادی کئے۔

جگا ہنس دیا۔ میں اپنی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ چاہے میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ میں شادی شدہ آدمیوں والا کام کرتا ہوں۔

تم ان انتظامات کیلئے قدرت کی مدد کا انتظار کرو۔

جگا اور زور سے ہنس دیا۔ ہاں بابو جی۔ میں کرتا ہوں۔ یہی وجہ تو ہے جو مجھے اس قید خانے میں لے آئی ہے۔ لیکن میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ اگر میں اس رات باہر نہ ہوتا تو میں خوش قسمتی سے آپ سے ملاقات کیسے کر پاتا۔ بابو جی! آپ سے انگلش سیکھنے کا میرے پاس پھر یہ موقع نہیں ہوگا۔ مجھے کچھ گٹ مٹ سکھا دیں جیسے کہ گڈ مارننگ' کیا آپ سکھا دیں گے۔ بابو جی صاحب؟

تم انگلش کا کیا کرو گے؟ اقبال نے کہا۔ اب تو صاحب بھی جا چکے ہیں۔ تمہیں

اپنی زبان سیکھنی چاہیے۔

جگا اس تجویز سے خوش نہیں ہوا۔ اس کیلئے' تعلیم کا مطلب انگلش سیکھنا تھا۔ کلرک اور خط لکھنے والے جو کہ اردو اور گورمکھی میں لکھ سکتے ہیں پڑھے لکھے تھے لیکن تعلیم یافتہ نہیں۔

یہ تو میں کسی سے بھی سیکھ سکتا ہوں۔ بھائی میت سنگھ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے گورمکھی سکھائیں گے۔ لیکن میں ہی ابتداء کرتا دکھائی نہیں دیتا بابو جی۔ آپ نے کتنی جماعتیں پڑھی ہیں؟ آپ نے ضرور میٹرک پاس کیا ہوگا؟

ہاں۔ میں دس پاس کر چکا ہوں۔ دراصل میں نے سولہ جماعتیں پاس کی ہیں۔

سولہ واہ واہ! میں اتنے پڑھے لکھے سے کبھی بھی نہیں ملا۔

ہمارے گاؤں میں صرف رام لال نے چار پاس کی تھیں۔ اب وہ مر چکا ہے۔ اب جو سب کچھ پڑھ سکتا ہے وہ میت سنگھ ہے ساتھ والے گاؤں میں۔ ان کے پاس کوئی بھی بھائی نہیں ہے۔ ہمارے انسپکٹر صاحب نے صرف سات تک پڑھا ہے اور ڈپٹی صاحب نے دس تک۔

سولہ۔ آپ ضرور بہت ذہین ہوں گے۔

اقبال اس کی رائے سن کر پریشان ہوگیا۔

کیا تم کچھ لکھ اور پڑھ سکتے ہو؟ اس نے پوچھا۔

میں؟ نہیں۔ میرے چچا کے بیٹے نے مجھے نظم کا ایک حصہ پڑھایا تھا جو کہ اس نے سکول سے سیکھا تھا۔ یہ آدھی انگلش اور آدھی ہندوستانی ہے۔

پیجن' کبوتر

اڈن' خلائے

لک' دیکھو

آسمان' سکائے

کیا آپ نے اسے سنا ہے؟

نہیں۔ اس نے تمہیں حروف تہجی نہیں سکھائے۔ اے بی سی وغیرہ۔

A.B.C وہ خود بھی نہیں جانتا۔ وہ اتنا ہی جانتا ہے جتنا کہ میں۔

اے۔ بی۔ سی کتھے گئی سی؟

ایڈورڈ مر گیا ہے۔ مس ماتم کرنے گئی تھی۔

تمہیں یہ آتی ہو گی۔

نہیں میں اس سے ناواقف ہوں۔

اچھا! آپ مجھے انگلش میں کچھ کہیں۔

اقبال راضی ہو گیا۔ اس نے جگا کو سکھایا کہ گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کسے کہتے ہیں۔ جب جگا نے زندگی کے اہم فنکشن پر بولے جانے والے الفاظ کو سیکھنا چاہا تو اقبال تنگ آ گیا۔

اتنے میں پانچ نئے قیدی ساتھ والی کوٹھری میں لائے گئے۔ جگا کا مزاج والا موڈ اتنی ہی جلدی ختم ہو گیا جتنی جلدی وہ آیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب بارش کم ہوتے ہوتے پھوار میں بدل گئی۔ دن نکل آیا۔ سب انسپکٹر سائیکل چلاتے ہوئے آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے ذرا کچھ فاصلے پر۔ بادل چھٹ چکے تھے صاف ستھرا کھلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ بارش کے بعد سورج کی روشنی کو ایک ڈھال مل گئی تھی۔ یہ زعفران کی ڈنڈیاں تھیں جو کہ بھیگی ہوئی کھیتی پر کھیل رہی تھیں۔ قوس قزاح نے آسمان کو اپنے گرد کس دیا تھا اور قصبہ چندن نگر مٹیالے رنگ میں ڈھلا ہوا لگ رہا تھا۔

سب انسپکٹر بہت تیز سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ جلدی پولیس اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا اس سے پہلے کہ اس کا ہیڈ کانسٹیبل مالی کی گرفتاری کا اندراج کر دے اسٹیشن ڈائری سے پھاڑے گئے صفحات سب کو ہی چوکنا کر دیں گے اور پھر گستاخ وکیلوں کے ان گنت سوالوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہیڈ کانسٹیبل بہت تجربے کار آدمی تھا لیکن جگا اور اقبال کی گرفتاری کے بعد انسپکٹر کا اس پر اعتماد کم ہو گیا تھا۔ وہ صورت حال پر قابو نہیں پا سکتا تھا جو کہ عام معمول کے مطابق نہیں تھی۔ کیا وہ جانتا ہے کہ قیدیوں کو کون سی کوٹھری میں رکھنا ہے؟

وہ ایک کسان تھا درمیانے طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کی عزت کرنے کے

جذبے سے بھرپور۔ اس میں اقبال کو تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے جگا اور ملی کو اکٹھا ایک کوٹھری میں بند کر دیا تو وہ دوبارہ سے قتل اور ڈاکے کے بارے میں آپس میں بات چیت کر لیں گے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا فیصلہ بھی کریں گے۔

جیسے ہی سب انسپکٹر کی سائیکل پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تو دو پولیس والے اس کے استقبال کیلئے آگے بڑھے جو کہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے سائیکل پکڑ لی اور دوسرے نے بارش میں باہر جانے کے بارے میں بڑبڑاتے ہوئے اس کی برساتی اتارنے میں مدد کی۔ ''ڈیوٹی۔''

سب انسپکٹر نے پر تکلف انداز میں کہا۔ ڈیوٹی' ڈیوٹی ہے بارش کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہاں تو اگر زلزلہ بھی آ جائے تو ڈیوٹی پہلے دو!

کیا ہیڈ کانسٹیبل واپس آ گیا ہے؟

ہاں۔ سر۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ملی کے گینگ کو پکڑ کر لائے ہیں اور اب اپنے کوارٹر چائے پینے گئے ہیں۔

کیا اس نے روز کی ڈائری میں اندراج کر لیا ہے؟

نہیں سر۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ یہ کام کرنے کیلئے آپ کا انتظار کریں گے۔

سب انسپکٹر مطمئن ہو گیا۔ وہ رپورٹنگ والے کمرے میں گیا کھونٹی میں اپنی پگڑی لٹکائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

میز ہر قسم کے رجسٹروں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک سے بڑا ایک رجسٹر اپنے پیلے کاغذوں میں مختلف کالم میں بٹا ہوا اس کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ اس نے آخری اندراج کو غور سے دیکھا۔ یہ اس کے اپنے ہاتھ کا اندراج تھا جو کہ اس کے صبح منوں مجرا کے ریسٹ ہاؤس میں جانے کے متعلق تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ رگڑتے ہوئے زور سے کہا۔ گڈ۔ اس نے اپنی ران پر زور دار ہاتھ مارا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی پیشانی سے پیچھے کی طرف لے گیا اور اپنے بالوں میں پھیرنے لگا۔

''ٹھیک''

اس نے دوبارہ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک''

ایک کانسٹیبل اس کیلئے چائے کا کپ لے آیا۔

سر آپ کے کپڑے گیلے ہیں۔ اس نے میز پر چائے رکھتے ہوئے کہا۔

سب انسپکٹر نے کانسٹیبل کی طرف دیکھے بغیر ہی چائے پکڑ لی۔

تم نے کیا ملی کے گروپ کو اس ہی کوٹھری میں بند کیا ہے جس میں جگا بند ہے؟

توبہ توبہ۔ کانسٹیبل نے اپنے کندھوں سے اوپر ہاتھ لے جاتے ہوئے وضاحت کی۔

سر۔ یہاں پولیس اسٹیشن میں تو قتل ہو جاتا۔ اگر آپ یہاں ہوتے جس وقت ہم ملی کو لائے تھے۔ جیسے ہی جگا نے انہیں دیکھا وہ تو پاگل ہو گیا۔ میں نے آج تک ایسی ماں۔ بہن اور بیٹی کی گالیاں نہیں سنی تھیں۔ اس نے ایک بھی نہیں چھوڑی۔ وہ سلاخوں کو اس وقت تک ہلاتا رہا جب تک کہ وہ سامنے بڑبڑاتے رہے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بس اب دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ ملی کو اس کے ساتھ رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ملی بھی کبھی اندر نہ جاتا۔ کیا کبھی شیر کے پنجرے میں بھیڑ کا بچہ گیا ہے۔

سب انسپکٹر مسکرا دیا۔ ملی آئندہ قسم نہیں کھائے گا۔

نہیں۔ وہ سچ مچ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا اور وہ مسلسل کہہ رہا تھا کہ اس نے منو مجرا میں ڈالے گئے ڈاکے میں کچھ نہیں کیا۔ جگا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ ان سے اور ان کی ماں بہن بیٹی سے سارا حساب چکا لے گا بس ایک دفعہ رہا ہو جائے۔

ملی کہہ رہا تھا کہ وہ اس سے اور مزید نہیں ڈرے گا جب تک کہ جگا اس جولاہے کی بیٹی کے ساتھ سوتا رہے گا۔

آپ اس وقت جگا کو دیکھتے۔ وہ جانوروں کا سا رویہ دکھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا اور چیخنے لگا۔ اس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارے اور لوہے کی سلاخوں کو ہلا دیا اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ ملی کے ہاتھ

پاؤں توڑ دے گا۔

میں نے آج تک کسی کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ہم کسی قسم کا کوئی چانس نہیں لے سکتے تھے اس لئے ہم نے ملی کو رپورٹ کرنے والے کمرے میں اس وقت تک بیٹھایا جب تک کہ جگا کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگیا۔ تب ہم جگا کو بابو کی کوٹھری میں لے گئے اور ملی والوں کو جگا کی کوٹھری میں۔ یہاں تو بہت اچھا تماشا ہوا ہو گا۔ سب انسپکٹر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

ہمیں کچھ اور بھی کرنا ہو گا۔ میں ملی اور اس کے ساتھیوں کو رہا کرنے جا رہا ہوں۔

کانسٹیبل گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا سب انسپکٹر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔

پالیسی، تم بھی یہ باتیں جان جاؤ گے جب میری طرح سروس میں رہو گے، جتنے عرصے سے میں ہوں۔ اتنا عرصہ۔

جاؤ اور دیکھو کہ کانسٹیبل صاحب نے اپنی چائے ختم کر لی ہو تو ان سے کہو کہ یہ زیادہ اہم ہے۔

تھوڑی دیر میں کانسٹیبل پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور ناگواری کے آثار تھے۔ کہ کوئی اس کی قابلیت کی تعریف کرنے کے بجائے اس کی مخالفت کر رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے اس کی اس بیزار مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا اور اس سے کہا کہ دروازہ بند کر دو اور بیٹھ جاؤ، ہیڈ کانسٹیبل کے تاثرات اس معاملے کے بارے میں جاننے کیلئے بدل گئے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور میز کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ جی سر کیا حکم ہے؟

بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔ انسپکٹر نے کہا۔ اس کی آواز میں سکون تھا۔ جلدی کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر پنسل کے باریک حصے سے اپنے کان کو کھجانے لگا اور بھوری میل کو دیکھنے لگا جو کہ اس کے کان سے نکلی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے

سگریٹ نکالی اور جلانے سے پہلے اسے کئی دفعہ فلٹر کی طرف سے ماچس کی ڈبی پر مارا۔ اس نے ایک زور دار کش لیا۔ دھواں اس کی ناک سے باہر نکلا اور سارے کمرے میں پھیل گیا۔

ہیڈ کانسٹیبل صاحب۔ آخر کار اس نے کہا اور کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔

ہیڈ کانسٹیبل صاحب۔ یہاں آج کرنے کیلئے بہت سا کام ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب کچھ خود کریں۔

ہاں سر۔ ہیڈ کانسٹیبل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

سب سے پہلے۔ ملی اور اس کے آدمیوں کو منوں مجرا لے جاؤ اور وہاں لے جا کر رہا کرو جہاں گاؤں والے انہیں رہا ہوتے ہوئے دیکھ سکیں۔ مندر کے نزدیک شاید پھر معمول کے مطابق گاؤں والوں سے پوچھ گچھ کر لینا کہ کسی نے سلطانہ کو دیکھا ہے یا اس کے گینگ کے متعلق کچھ پوچھ لینا۔

لیکن کیوں سر؟ ہیڈ کانسٹیبل سب انسپکٹر کی بات نہیں سمجھ سکا۔ تمہیں کیوں کہنے کی۔ کوئی ضرورت نہیں۔ تم صرف اپنی کارردائی مکمل کرو۔

لیکن سر۔ سلطانہ اور اس کے ساتھی تو پاکستان چلے گئے ہیں ہر کوئی یہ جانتا ہے۔

سب انسپکٹر نے پنسل کی نوک کو دوبارہ کان میں ڈالا اور میل کو میز پر رگڑ دیا۔ اس نے سگریٹ نکالی اور اس دفعہ اپنے ہونٹ اکڑا لئے اور دھوئیں کا ایک دائرہ رجسٹر سے ہیڈ کانسٹیبل کے چہرے پر پھیل گیا۔

میں نہیں جانتا کہ سلطانہ پاکستان جا چکا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہ منوں مجرا میں ڈاکہ ڈالنے کے بعد گیا ہو گا۔ اس بات میں کوئی نقصان نہیں کہ گاؤں والوں سے پوچھا جائے کہ کیا وہ جانتے ہیں کہ وہ کب گیا کدھر گیا؟

ہیڈ کانسٹیبل کا منہ لٹک گیا۔

میں سمجھ گیا۔ سر۔ کیا کوئی اور حکم بھی ہے؟

ہاں۔ گاؤں والوں سے یہ بھی پوچھو کہ کیا وہ اس شرارتی مسلم لیگی اقبال کے

بارے میں کچھ جانتے ہیں جب وہ منوں مجرا میں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل دوبارہ پریشان دکھائی دینے لگا۔

سر۔ بابو کا نام تو اقبال سنگھ ہے۔ وہ ایک سکھ ہے۔ وہ انگلینڈ میں رہتا رہا ہے اور اس کے لمبے بالوں کی تراش کا انداز۔

سب انسپکٹر نے گھور کر کانسٹیبل کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

یہاں بہت سے اقبال ہیں۔ میں محمد اقبال کی بات کر رہا ہوں۔ تم اقبال سنگھ کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ محمد اقبال مسلم لیگ کا ایک ممبر ہے۔

میں سمجھ گیا۔ سر۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دوبارہ کہا۔

لیکن وہ حقیقت میں نہیں سمجھ پایا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس اسکیم کے نتائج کی وجوہات کو سمجھ پائے گا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔

صرف ایک چیز اور' سب انسپکٹر نے میز پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک کانسٹیبل کو میرا لکھا ہوا خط دے کر مسلم مہاجرین کیمپ کے کمانڈر کو بھیجو۔

مجھے یہ بھی یاد دلانا کہ کل چند کانسٹیبلوں کو منوں مجرا بھیجنا ہے جب پاکستانی فوج گاؤں کے مسلمانوں کو ان خطرناک علاقوں سے لینے آئے گی۔

ہیڈ کانسٹیبل کو اندازہ ہوگیا کہ یہ سب باتیں اس کو پلان کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

اس نے اپنے ذہن کو تیار کیا۔ دوسری بار سلیوٹ کیا اور اس کی ہیل کٹ زور سے بجی۔

جی سر۔ اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔

سب انسپکٹر نے اپنی پگڑی پہن۔ اور دروازے کے پاس کھڑا ہو کر اسٹیشن کے صحن کو دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ریلوے کی دیوار پر ایک بیل اوپر کو جا رہی تھی جو کہ بارش سے دھلی ہوئی تھی۔ اس کے پتے سورج میں چمک رہے تھے۔ بائیں طرف پولیس والوں کے سونے کیلئے ایک ہی کمرے میں بہت سی چارپائیاں صاف ستھرے بستروں کے ساتھ ترتیب سے بچھی ہوئی تھیں۔ ان سونے کے کمرے کے مخالف میں دو کوٹھریاں تھیں۔

حقیقت میں وہ معمولی سے لوہے کی سلاخوں سے بنے کمرے تھے جن کے سامنے کی دیوار اینٹوں کی بجائے لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے صحن کی ہر چیز ہر طرف سے صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

قریبی کوٹھری میں۔ اقبال چارپائی پر اپنے پاؤں رکھے ہوئے کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بہت سے اخبارات فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ جگت سنگھ قید خانے کی سلاخوں کو ہاتھوں سے پکڑے یونہی پولیس کوارٹرز کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔

ملی اور اس کے ساتھی فرش پر پاؤں پسارے بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے جب انہوں نے ہیڈ کانسٹیبل اور تین پولیس والوں کو راتفل کے ساتھ ہتھکڑیاں لیے آتے دیکھا۔

جگت سنگھ نے پولیس والوں کی اپنی ساتھ والی کوٹھری میں جانے پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے سوچا شاید ملی کو عدالت میں پیشی کیلئے لے جایا جا رہا ہے۔

ملی جگت سنگھ سے ہاتھ ملانے کیلئے اس کی کوٹھڑی کے پاس گیا۔ وہ جگت سنگھ سے خوفزدہ تھا اور دوبارہ اس سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ دنگا فساد کے خوف سے نکل سکے کیونکہ جگا اس ضلع کا سب سے زیادہ تشدد پسند آدمی تھا۔ جگت سنگھ کی گالیوں نے اسے ناممکن بنا دیا۔ ملی اپنے گروپ کا سردار تھا۔ جگا کی طرف سے بے عزتی ہونے کے بعد اس نے محسوس کیا۔ اپنے ساتھیوں کی نظروں میں عزت کو قائم رکھنے کیلئے اسے بھی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

اس نے بہت سی گندی غلیظ باتیں سوچیں۔ کہ اگر جگت سنگھ اس کی دوستی کی پیشکش کو گالیوں سے لوٹائے گا تو وہ بھی اسے گالیوں کے بدلے گالیاں اور دھمکیاں دے گا۔

لوہے کی سلاخیں ان کے درمیان حائل تھیں اور مسلح پولیس والے وہاں موجود تھے۔

پولیس والوں نے ملی اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگائیں اور یہ ساری ہتھکڑیاں ایک لمبی سی زنجیر سے بندھی ہوئی تھیں جو کہ ایک سپاہی کی بیلٹ سے بندھی ہوئی

تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل انہیں وہاں سے دور لے گیا۔ دو مسلح سپاہی اپنی رائفلوں کے ساتھ ان کے پیچھے چل رہے تھے۔

جب وہ اپنے قید خانے میں سے نکلنے لگے تو جگا نے ملی کی طرف دیکھا اور پھر باہر دور دیکھنے لگا۔

کیا تم پرانے دوستوں کو بھول گئے ہو۔ ملی نے دوستانہ انداز میں مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ تم تو ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں اور ہم تمہارے لئے مرے جا رہے ہیں۔ ملی کے ساتھی ہنسنے لگے۔ اسے بھی لے چلو۔ اسے بھی لے چلو۔

جگت سنگھ اپنی آنکھیں زمین پر مسلسل گاڑھے ہوئے بیٹھا رہا۔ تم اتنے ناراض کیوں ہو۔ میرے دوست اتنے اداس کیوں ہو؟

یہ کسی کی محبت ہے جو تمہاری روح کو تڑپا رہی ہے۔

بس کرو جلدی چلو۔ سپاہی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ وہ اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کیا ہم اپنے پرانے دوست کو ست سری کال نہیں کہہ سکتے؟ ست سری کال۔ سردار جگت سنگھ جی۔ کیا تمہارا کوئی پیغام ہے جو ہم پہنچا سکیں۔ محبت کا کوئی پیغام بھی ہو سکتا ہے۔ جولاہے کی بیٹی کیلئے؟

جگت سنگھ کوٹھری سے باہر دیکھتا رہا جیسے کہ اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے کوٹھری کی سلاخوں کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ملی اپنے ہنستے ہوئے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

سردار جگت سنگھ آج کچھ پریشان دکھائی دیتا ہے۔ اس نے تو ہمارے ست سری کال کا جواب بھی نہیں دیا۔ لیکن ہم برا نہیں مانتے۔ ہم اسے دوبارہ ست سری کال کہیں گے۔

ملی نے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھ جوڑے اور بڑے شوق سے جگت سنگھ کی کوٹھری کے لوہے کے دروازے کے پاس آ کر جھک گیا اور زور زور سے کہنا شروع کر دیا۔

ست سری کال۔ ست سر کال۔

جگا کے ہاتھ لوہے کی سلاخوں سے نکلے اور اس کی پگڑی کے پیچھے سے نکلنے والے بالوں سے اسے پکڑ لیا۔ ملی کی پگڑی گر گئی۔ جگا قاتلانہ انداز میں چیخ رہا تھا اور ملی کے سر کو جھٹکے دے کر لوہے کی سلاخوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ ملی کو اس طرح سے ہلا رہا تھا جیسے کوئی کپڑے کے ٹکڑے کو ایک طرف سے دوسری طرف آگے پیچھے مارتا ہے اس کا سر بار بار سلاخوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ ماں کی گالی تھی۔

یہ تیری بہن کیلئے۔ یہ تیری بیٹی کیلئے۔ یہ تیری ماں کیلئے دوبارہ اور یہ اور یہ..........؟

اقبال جو کہ اپنی کرسی پر بیٹھا لڑائی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اور پولیس والوں پر چیخنے لگا۔

تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ وہ اس آدمی کو مار دے گا؟

پولیس والوں نے بھی چلانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائفل کے پچھلے حصے کو جگا کے منہ پر مار کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ ملی کا سر خون کے چھینٹوں سے بھر گیا تھا۔ اس کا سر اور ماتھا بری طرح سے زخمی ہو گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ ملی کی چیخوں کی آواز سن کر سب انسپکٹر دوڑتا ہوا کوٹھری کے پاس آیا اور جگا کے ہاتھوں پر اپنا ڈنڈا مارنا شروع کر دیا۔ لیکن جگا نے پھر بھی ملی کو نہ چھوڑا۔

سب انسپکٹر نے اپنا ریوالور نکالا اور جگا کا نشانہ لے لیا۔

چھوڑ دو۔ بے غیرت انسان ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔

جگا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ملی کے بالوں کو چھوڑ دیا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے اسے دور دھکا دیتے ہوئے اور گالیاں دیں۔

ملی سر اور کاندھوں پر بال بکھرائے ہوئے ان نوازشات کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے کھڑا کرنے میں مدد دی اور اس کی پگڑی سے اس کا خون اور اس کے منہ پر پڑا تھوک صاف کرنے لگے۔ ملی ایک بچے کی طرح چیخ رہا تھا اور مسلسل بد دعائیں دے رہا تھا۔

اللہ کرے تیری ماں مرے۔ تو خنزیر کا بچہ۔ میں تیرے سے اس کا بدلہ لے لوں گا۔

ملی اور اس کے آدمی باہر چلے گئے ملی کے چیخنے چلانے کی آوازیں اس کے پولیس اسٹیشن سے بہت دور جانے کے بعد بھی سنی جا سکتی تھیں۔ جگا دوبارہ سے سوچوں میں ڈوب گیا جس میں وہ غصہ آنے سے پہلے بھی ڈوبا ہوا تھا وہ اس چوٹ کو دیکھنے لگا جو کہ سب انسپکٹر نے بے قابو ہو کر اس کے ہاتھ کے پچھلے حصے پر اپنی چھڑی سے لگائی تھی۔

اقبال ہیجان کی کیفیت میں اب بھی چلائے جا رہا تھا۔ جگا غصے سے اس کی طرف مڑا۔

چپ ہو جاؤ۔ تم بابو! میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے جو تم اتنا بول رہے ہو؟

جگا نے اس سے اس سے پہلے کبھی اتنی اکڑ سے بات نہیں کی تھی۔ اس چیز نے اقبال کو اور زیادہ خوفزدہ کر دیا۔

انسپکٹر صاحب اب تو دوسری کوٹھری خالی ہے۔ آپ مجھے ادھر کیوں نہیں بھیج دیتے؟ اس نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

سب انسپکٹر متکبرانہ انداز میں مسکرایا۔

یقیناً مسٹر اقبال۔ ہم آپ کو آرام دینے کیلئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔ میز، کرسی، بجلی کا پنکھا، جو بھی ممکن ہوا آپ کو دیں گے۔

○

منوں مجرا

جب یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ ٹرین لاشوں سے بھر کر آئی تھی تو پورے گاؤں میں خوف اور افسردگی خاموش بارش کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کرنے لگے اور کچھ ساری ساری رات بیٹھ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے۔ ہر کوئی یہ سوچتا کہ اس کا پڑوسی اس کے خلاف ہے کسی وقت بھی کچھ کر سکتا ہے وہ سوچتے کہ اپنے زیادہ سے زیادہ دوست اور حلیف بنائیں۔ انہوں نے ان بادلوں کا کوئی خیال نہ کیا جو کہ ستاروں کے درمیان بدنما داغ لگ رہے تھے۔ نہ ہی ٹھنڈی گیلی ہوا کی خوشبو کا جب وہ صبح کو جاگتے اور دیکھتے کہ بارش ہو رہی ہے تو ان کا ذہن سب سے پہلے ٹرین اور جلتی ہوئی لاشوں پر جاتا۔ سارا گاؤں چھتوں پر چڑھا اسٹیشن کی طرف دیکھ رہا ہوتا تھا لیکن ٹرین جس طرح پراسرار انداز میں آئی تھی اسی طرح غائب ہو گئی۔ سپاہیوں کے خیمے پانی سے بھر گئے تھے۔ وہ پریشان دکھائی دیتے تھے۔ وہاں پر نہ تو سلگتی ہوئی آگ تھی اور نہ ہی دھواں۔ وہاں زندگی اور موت کے کوئی آثار باقی نہ رہے تھے۔ لوگ مسلسل دیکھتے رہتے کہ شاید کوئی اور لاشوں سے بھری ٹرین آ جائے۔

دوپہر کو بادل ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے مغرب کی طرف چلے گئے۔ بارش نے ساری فضا کو صاف کر دیا اور کوئی بھی میلوں دور تک دیکھ سکتا تھا۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ ہمت کر کے اپنے گھروں سے یہ جاننے کیلئے باہر نکلنے لگے کہ شاید کوئی اور ان سے زیادہ

جانتا ہو۔ ادھر ادھر گھوم کر وہ اپنی چھتوں پر واپس آ جاتے۔ اگرچہ بارش رک چکی تھی لیکن کوئی بھی شخص اسٹیشن کے پلیٹ فارم، مسافر خانے اور ملٹری کیمپ میں نظر نہیں آتا تھا۔ گدھوں کی ایک قطار ریلوے اسٹیشن کی بلڈنگ کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی تھی اور چیلیں اس سے اونچے دائرے میں اڑ رہی تھیں۔

ہیڈ کانسٹیبل پولیس کے ایک دستے اور قیدیوں کے ساتھ گاؤں سے ذرا دور رک گیا۔ لوگوں نے چلا چلا کر ایک دوسرے کو اطلاع دی۔ نمبردار کو بھی بلوا لیا گیا۔ جب ہیڈ کانسٹیبل اپنی پارٹی کے ساتھ پہنچا تو ایک جم غفیر مندر کے قریب پیپل کے درخت کے نیچے جمع تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے گاؤں والوں کے سامنے قیدیوں کی ہتھکڑیوں کو کھولا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر انگوٹھے لگائے یہ دکھانے کیلئے کہ یہ ضمانت کے کاغذ ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں کہا کہ ہر دو ہفتے بعد پولیس اسٹیشن آ کر رپورٹ دینی ہے۔

گاؤں والے ناراض نظر آ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جگا بدمعاش اور اس اجنبی کا ڈاکے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پولیس نے ملی اور اس کے گینگ کو گرفتار کیا تھا تو وہ یہی سوچ رہے تھے کہ پولیس نے بالکل صحیح سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ لیکن شاید اس قتل میں سب شامل نہیں تھے۔ ایسا ہونا مشکل ہی سے ممکن تھا کہ ان میں سے کسی نے اس میں کچھ نہ کیا ہو۔ یہی پولیس ان کو پکڑ کر لے گئی تھی اور اب چھوڑ کر جا رہی تھی۔ ان کے اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ منوں مجرا میں جہاں انہوں نے قتل کیا تھا۔ پولیس کو یقیناً ان کی بے گناہی کا یقین تھا جو وہ یہ خطرہ مول لے رہی تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل نمبردار کو ایک طرف لے گیا اور دونوں ایک دوسرے سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ نمبردار واپس آیا اور گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ سنتری صاحب جاننا چاہتے ہیں کہ کیا کسی شخص نے سلطانہ بدمعاش کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ یا اسے دیکھا ہے یا اس کے گینگ کے بارے میں کوئی کچھ جانتا ہے؟ بہت سے گاؤں والے اس جانکاری کے ساتھ آئے کہ اس کے بارے میں یہی جانا جاتا ہے کہ وہ اپنے گینگ کے ساتھ پاکستان جا چکا ہے۔

وہ سب مسلمان تھے۔ اور ان کے گاؤں کے مسلمان یہ علاقہ خالی کر کے جا چکے تھے۔ وہ لالہ کے قتل سے پہلے یا بعد میں گیا تھا؟ کانسٹیبل یہی معلومات لینے کیلئے نمبردار کے ساتھ آیا تھا۔

بعد میں انہوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ گاؤں والے پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ ان میں ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پولیس والوں سے کوئی سوال پوچھتے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

کیا تم میں سے کسی نے ایک نوجوان مسلمان بابو محمد اقبال جو کہ مسلم لیگ کا ممبر ہے کو دیکھا ہے یا اس سے باتیں کی ہیں؟

نمبردار ششدر رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اقبال سکھ نہیں بلکہ مسلمان تھا۔ اس نے مشکوک انداز میں میت سنگھ اور امام بخش کو بلایا جو کہ اسے اقبال سنگھ کہتے تھے۔ اس نے ہجوم میں ادھر ادھر امام بخش کو دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ گاؤں والے جوش میں آ کر ہیڈ کانسٹیبل سے کہنے لگے کہ انہوں نے اقبال کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ پل کے نزدیک ریلوے پٹڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ رک رک کر چل رہا تھا۔

کیا تم نے اس میں اپنے ساتھیوں کیلئے کسی قسم کی کوئی مشتبہ چیز دیکھی تھی؟

کوئی بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں یہ بالکل یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سب مشکوک مکار تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ میت سنگھ ہی واحد شخص تھا جس نے بابو سے سوال جواب کئے تھے۔ بابو کی چند چیزیں اب بھی اس کے پاس گردوارے میں رکھی ہوئی تھیں۔ میت سنگھ نے آگے کی طرف دھکا دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے میت سنگھ کو نظر انداز کر دیا۔ اور دوبارہ ان لوگوں سے مخاطب ہوا جو کہ اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

میں بھائی سے بعد میں بات کروں گا۔ اس نے کہا کیا تم میں سے کوئی ایک بتا سکتا ہے کہ یہ آدمی منوں مجرا میں ڈاکے سے پہلے آیا تھا یا بعد میں؟

یہ ایک اور دھچکا تھا۔ ایک شہری بابو کا ڈاکے یا قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ پیسے کیلئے نہ کیا گیا ہو۔

کسی کو بھی پکا یقین نہیں تھا۔ اب انہیں کسی بھی چیز کا یقین نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے یہ کہہ کر مجلس برخاست کر دی کہ اگر کسی کو زمیندار کے قتل یا سلطانہ کے بارے میں یا محمد اقبال کے بارے میں کوئی مستند معلومات ہو تو وہ فوراً پولیس اسٹیشن اطلاع کرے۔

ہجوم چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تبدیل ہو کر ایک دوسرے سے کن اکھیوں میں باتیں کرنے لگا۔ میت سنگھ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس گیا جو کہ اپنے سپاہیوں کو واپس لے جانے کی غرض سے مارچ کیلئے تیار کر رہا تھا۔

سنتری صاحب۔ جو جوان آدمی آپ نے اگلے دن گرفتار کیا تھا مسلمان نہیں تھا۔ وہ سکھ ہے۔ اقبال سنگھ۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ایک پیلے کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھنے میں مصروف رہا۔ میت سنگھ اپنی بات سنانے کیلئے بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ سنتری صاحب۔ وہ دوبارہ شروع ہو گیا جب وہ دوسرا کاغذ لپیٹ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اب بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو انگلی سے اشارہ کیا اور اس کو کاغذ پکڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

سائیکل یا ٹانگہ لو اور اس خط کو پاکستان ملٹری یونٹ کے کمانڈر تک پہنچا دو اور اپنی طرف سے کہنا کہ تم منوں مجرا سے آئے ہو اور صورت حال بہت خراب ہے۔ وہ اپنا ٹرک اور سپاہی بھیج کر مسلمانوں کو اس خطرناک علاقے سے لے جائیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ فوراً۔

جی سر۔ کانسٹیبل نے اپنی سائیکل کی بیل بجاتے ہوئے جواب دیا۔

سنتری صاحب۔ میت سنگھ نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

سنتری صاحب۔ سنتری صاحب۔ سنتری صاحب۔ ہیڈ کانسٹیبل نے غصے سے دہرایا۔ تم نے سنتری صاحب کہہ کہہ کر میرے کان کھا لئے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟

اقبال سنگھ ایک سکھ ہے۔

کیا تم نے اس کی پینٹ کے آگے کے بٹن کھول کر دیکھا ہے کہ آیا وہ مسلمان

ہے یا سکھ۔ تم مندر کے ایک سیدھے سادھے بھائی ہو۔ جاؤ اور پوجا کرو۔ ہیڈ کانسٹیبل نے پولیس والوں کے سامنے مارچ کیلئے اپنی جگہ لے لی۔

آٹین شن! بائیں طرف سے جلدی مارچ کرو۔

میت سنگھ گاؤں والوں کے مشکوک سوالوں کا جواب دیئے بغیر ہی مندر چلا گیا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے منوں مجرا کے نقشے کو بڑی صفائی سے ایک چاقو کی مانند دو حصوں میں تقسیم کر دیا جس طرح ایک چاقو ایک چپٹی مکھن کی ٹکیاں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

مسلمان اپنے گھروں میں اداس رہنے لگے۔ سکھوں کی طرف سے پٹیالہ انبالہ اور کپورتھلا کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کے بارے میں سنتے اور اس پر یقین کیے بغیر اپنے گھروں میں واپس آ جاتے۔ انہوں نے مسلمان خاندانوں کی شریف عورتوں کے بارے میں سنا کہ ان کے برقعے اتار دیئے گئے اور گلیوں کے بیچ ہجوم کے درمیان بازار میں ان کی عزت لوٹی گئیں۔ بہت سی مسلمان عورتیں جو اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہو گئیں انہوں نے خودکشی کر لی۔

انہوں نے یہ بھی سنا کہ سکھوں نے خنزیر کو مسجد میں ذبح کر کے مسجد کی بے ادبی کی اور ہندوؤں نے پاک قرآن مجید میں سے صفحے نکال کر پھاڑ دیئے اور قرآن مجید کی بے ادبی کی۔ بہت جلد ہی منوں مجرا کا ہر سکھ مسلمانوں کو شہید کرنے اور لوٹنے کیلئے تیار ہو گیا۔ ان کے لمبے بال اور داڑھی انہیں وحشی ظاہر کر رہی تھی۔ ان کے کرپان مسلمانوں کو خطرناک دھمکیاں دیتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پہلی بار پاکستان کا نام ان کیلئے کوئی معنی لے کر آیا۔ مہاجروں کی جنت جہاں سکھ نہیں تھے۔

سکھ مسلمانوں سے ناراض اور بیزار ہو چکے تھے۔ وہ کہتے مسلمانوں پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔

سکھ پناہ گزین اپنی عورتوں سے کہتے کہ مسلمانوں کے ہتھے چڑھنے سے بہتر ہے کہ کنوؤں میں چھلانگ لگا دو یا اپنے آپ کو جلا دو۔ ان میں سے جو خودکشی پر آمادہ نہ ہوتیں۔ انہیں گلیوں میں سب کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا۔ عزت لوٹی جاتی اور پھر قتل کر دیا

جاتا تھا۔ اب مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے سکھوں کی لاشوں سے بھری ایک ٹرین جلائے جانے کیلئے منوں مجرا لائی گئی تھی۔ پاکستان سے ہندو اور سکھ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے کئی نے منوں مجرا میں پناہ حاصل کی۔ پھر یہاں پر رام لال کا قتل ہوا تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے لیکن ہر کسی کو یہ ضرور معلوم تھا کہ رام لال ایک ہندو تھا جبکہ سلطانہ اور اس کا گینگ مسلمان تھا اور وہ پاکستان فرار ہو چکے تھے۔ ایک اجنبی کردار بغیر پگڑی اور داڑھی کے گاؤں میں ادھر ادھر پھرتا نظر آیا تھا۔ یہ سب باتیں مسلمانوں سے ناراض ہونے کیلئے کافی تھیں۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ دلائل سکھوں کیلئے کبھی بھی اہم ثابت نہیں ہوئے تھے۔ جب وہ برانگیختہ ہوتے تھے تو دلائل کی ان کے سامنے کوئی اہمیت نہ تھی۔

یہ ایک اداس رات تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں بادلوں کو دوبارہ سے لے آئیں۔ بادل کالے دیو پیکر کی صورت میں آئے اور آسمان پر پھیل گئے جس کے بعد بغیر بجلی کے چمکے اور بادلوں کے گرجے بارش شروع ہوگئی۔

سکھ کسانوں کا ایک گروہ نمبردار کے گھر جمع تھا۔ وہ لالٹین میں ایک گول دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ چارپائی پر جبکہ دوسرے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میت سنگھ ان کے درمیان تھا۔ کافی دیر تک کسی نے بار بار اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ خدا ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ وہاں بہت ظلم ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ برے کام کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔

تب جوانوں میں سے ایک بولا۔ ہم نے ایسا کیا کیا ہے جو ہمیں یہ سزا مل رہی ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنے بھائی بہنوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہماری جاسوسی کرنے کیلئے کسی کو کیوں بھیجا؟

تمہارا مطلب ہے اقبال؟ میت سنگھ نے کہا۔

میری اس سے طویل گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے ہم سکھوں کی طرح لوہے کا ایک کڑا پہنا ہوا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ اسے پہنے۔ اس لئے اس نے پہنا۔ وہ حجامت بنوانے والا سکھ تھا وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ اور وہ زمیندار کے قتل

کے ایک دن بعد آیا تھا۔

بھائی۔ تم اس کو اتنا آسان سمجھ رہے ہو۔ اسی نوجوان نے دوبارہ کہا۔ کیا ایک لوہے کا کڑا پہننا مسلمان کو کوئی نقصان پہنچائے گا یا دن میں سگریٹ نہ پینا خاص کر جب اس کے سامنے کوئی بڑا مقصد ہو۔

میں ایک سیدھا سادھا بھائی ہو سکتا ہوں۔ میت سنگھ نے جوش سے اعتراف کیا۔ لیکن میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ تم وہ یہ کہ قتل میں بابو کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ گاؤں میں کبھی تھا ہی نہیں یا دوسرے لفظوں میں اگر تھا بھی وہ تو......؟ یہ تو ہر کوئی موٹے دماغ والا بھی سمجھ سکتا ہے۔

نوجوان سکھ تھوڑا شرمندہ ہوگیا۔

اس کے ساتھ ساتھ میت سنگھ نے مزید اعتماد سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے پہلے ہی ملی کو ڈاکے کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔

تم کیسے جانتے ہو کہ انہوں نے ملی کو اس لئے گرفتار کیا تھا۔ نوجوان سکھ نے پھر سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

ہاں۔ جو پولیس جانتی ہے وہ تم کیسے جانتے ہو؟ وہ ملی کو رہا کر چکے ہیں۔ کیا تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ قاتلوں کو بغیر مقدمے کی سماعت سنے اور اپنا فرض پورا کئے بغیر نہیں رہا کرتے؟ دوسروں نے پوچھا۔

بھائی۔ تم ہمیشہ بغیر کسی دلائل کے بات کرتے ہو۔ اچھا۔ اگر تم سب کے پاس دلائل ہیں تو ذرا مجھے بتاؤ کہ کس نے چوڑیوں کا پیکٹ جگا کے گھر میں پھینکا تھا؟

ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

میں تمہیں بتاؤں گا۔ یہ جگے کا دشمن ملی تھا۔ تم سب جانتے ہو کہ وہ ختم ہو چکے ہیں۔ ان کے سوا جگا کی بے عزتی کرنے کی کون جرات کرسکتا ہے؟ کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ میت سنگھ اپنی بات کو جارحانہ انداز میں اس کی منزل تک پہنچا رہا تھا۔

اور یہ سب سلطانہ کے متعلق۔ سلطانہ! اس ڈاکے سے اس کا کیا تعلق تھا۔

ہاں بھائی جی۔ ہو سکتا ہے تمہاری بات ٹھیک ہو۔ ایک جوان نے کہا۔ لیکن لالہ

مر چکا ہے۔ ہم اس کے بارے میں کیوں پریشان ہوں۔ پولیس خود اس سے نمٹ لے
گی۔ چھوڑو جگا۔ ملی اور سلطانہ کو وہ خود اپنے جھگڑے نمٹ لیں گے۔ ہمیں کیا پڑی
ہے۔ ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ کیا کریں جن سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے؟
نسلوں سے ہمارا نمک کھا رہے ہیں اور دیکھو ہم ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرتے
ہیں اور وہ سانپ کی مانند رویہ دکھاتے ہیں۔

یہاں بیٹھے سب لوگوں کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ میت سنگھ غصے سے بولا۔

وہ تمہارے ساتھ کیا برا کر چکے ہیں۔ کیا انہوں نے تم سے تمہاری زمین چھینی
ہے اور ورغلایا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کیا کیا ہے؟

پناہ گزینوں سے جا کر پوچھو کہ مسلمانوں نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے۔ ایک
جنگجو جوان نے اپنے دلائل شروع کرتے ہوئے کہا۔

تمہارے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ جھوٹے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ گردوارہ
جلایا گیا ہے اور لوگوں کا قتل عام کیا گیا ہے؟ میں صرف منوں مجرا کی بات کر رہا تھا۔
ہمارے مزارعوں نے کیا کیا ہے؟

وہ مسلمان ہیں۔ میت سنگھ نے اپنے کندھے اچکا دیئے۔ نمبردار نے محسوس کیا
کہ اس کی طرف سے زیادہ ہی دلائل دیئے گئے تھے۔ کیا ہوا تھا واقعہ؟ اس نے عقلمندی
سے پوچھا۔

ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ یہ مہاجرین جو مندر آ چکے ہیں
کہیں ایسا کچھ نہ کر دیں کہ جس سے گاؤں کا نام بدنام ہو۔

کچھ چیزوں کے حوالوں نے یہاں موجود سب لوگوں کا موڈ بدل دیا۔

باہر والے اپنے گاؤں کے ساتھیوں سے کچھ کرنے کی جرات کیسے کر سکتے ہیں؟
یہ دلائل کے راستے میں ایک اور بڑی رکاوٹ تھی۔ ساتھیوں سے وفاداری بہت بڑی وجہ
تھی۔ وہ نوجوان جو مسلمانوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا غرور سے بولا۔ ''جب تک ہم زندہ ہیں
کوئی ہمارے مزارعوں کے خلاف انگلی تو اٹھا کر دکھائے۔''

نمبردار نے اسے جھاڑ دیا۔ تم ایک جوشیلے انسان ہو۔ کبھی تم مسلمانوں کو قتل کرنا

چاہتے ہو۔ کبھی تم سکھ مہاجروں کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ ہم کچھ کہہ رہے ہیں اور تم کسی اور
طرف بات کر رہے ہو۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ نمبردارا۔ لڑکے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اگر تم سب چالاک ہو تو تم کچھ کہو۔

سنو بھائیو۔ نمبردار نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ یہ غصہ کرنے کا وقت
نہیں ہے۔ کوئی بھی کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا لیکن کون کسی دوسرے کے دل کی بات جان
سکتا ہے۔ آج ہمارے پاس چالیس یا پچاس پناہ گزین ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنے
امن پسند ہیں۔ اور کتنے تشدد پسند۔ ہم ان پناہ گزین سکھوں پر کیسے اعتبار کر سکتے ہیں۔
لیکن ہم ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمارے گاؤں منوں مجرا آ کر پناہ نہ لیں۔ وہ آ
جاتے ہیں۔ تو کیا ہم ان سے اپنے مزارعوں کا بدلہ لے سکیں گے؟ تم نے سینکڑوں ہزاروں
روپے کے مول کی بات کی ہے۔ ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ ہمیں بھی اسی بارے میں
سوچنا چاہیے۔ کسان اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ مہاجروں کو پناہ دینے
سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مہمان نوازی کوئی کھیل نہیں ہے یہ تو ایک نیکی کا کام ہے کہ
بے گھروں کو گھر دیا جائے۔ کیا وہ اپنے ساتھی مسلمانوں کو جانے کیلئے کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر
ہے کبھی نہیں۔ اپنے گاؤں کے ساتھیوں سے وفاداری ہر قسم کی صورت حال میں اہم ہے۔
جس قسم کے الفاظ وہ استعمال کریں گے کسی میں اتنا حوصلہ نہیں ہوگا کہ کوئی انہیں باہر نکال
پھینکے۔ چاہے وہ سکھوں کا مجمع ہی کیوں نہ ہو۔ سارے ہجوم کا مزاج غصے سے حیرانی و
پریشانی میں بدل گیا۔

کچھ دیر بعد نمبردار بولا۔

ساتھ والے گاؤں کے تمام مسلمان خطرناک علاقہ خالی کر چکے ہیں اور انہیں
چندن نگر کے قریبی مہاجرین کیمپ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ کچھ پہلے ہی پاکستان جا چکے
ہیں۔ دوسروں کو جالندھر کے سب سے بڑے کیمپ میں بھیجا جا چکا ہے۔

ہاں۔ باقی سکھوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

کپورا اور جوجوتا گاؤں پچھلے ہفتے خالی کرائے گئے تھے۔ صرف منوں مجرا ہی

وہ واحد جگہ ہے جہاں مسلمان ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے گاؤں والوں کو یہاں رہنے کیلئے کیسے کہیں گے۔ ہم اپنے مزارعوں کو کبھی بھی ایسا نہیں کہہ سکیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنے بیٹوں کو کہیں کہ اپنے گھروں سے چلے جاؤ۔ کیا یہاں پر کوئی ایسا ہے جو مسلمانوں کو کہہ سکتا ہو کہ بھائیو! تمہیں منوں مجرا سے چلے جانا چاہیے؟

اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا ایک دوسرا دیہاتی اندر داخل ہوا اور چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا۔ ہر کوئی اسے دیکھنے کیلئے مڑا لیکن وہ لالٹین کی ہلکی روشنی میں اسے پہچان نہ سکے۔

کون ہے یہ؟

نمبردار نے لیمپ کی طرف سے اپنی آنکھوں پر سایہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اندر آ جاؤ۔ امام بخش اندر آ گیا۔ دو اور مزارعے اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ وہ بھی مسلمان تھے۔

سلام چچا امام بخش۔ سلام خیر دینا۔ سلام۔ سلام۔

ست سری کال، نمبردارا۔ ست سری کال۔ مسلمانوں نے جواب دیا لوگوں نے ان کے بیٹھنے کیلئے جگہ بنائی۔ اور امام بخش کے بات شروع کرنے کا انتظار کرنے لگے۔

امام بخش نے اپنی انگلیوں سے اپنی داڑھی میں کنگھی کی۔

اچھا۔ بھائیو۔ ہمارے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ اس نے صاف پوچھا۔

چاروں طرف ایک تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ ہر کوئی نمبردار کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم کیوں بتائیں۔ جتنا یہ ہمارا گاؤں ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔ تم نے سنا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ سارے پڑوس کے گاؤں خالی کرائے جا چکے ہیں۔ صرف ہم بچے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم بھی چلے جائیں تو ہم چلے جائیں گے۔

میت سنگھ نے ناک بھوں چڑھانا شروع کر دی۔ لیکن وہ صرف ایک پجاری تھا جو ان چیزوں پر گزارہ کرتا تھا جو گاؤں والے اسے دے دیتے تے۔ ایک جوان آدمی بولا۔

''یہ تو آپ کی پسند ہے۔ چچا امام بخش۔ جب تک ہم یہاں ہیں کوئی آپ کو

ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ پہلے ہم مریں گے اور پھر تم۔''

''ہاں۔'' ایک اور نے جوش سے حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے ہم پھر تم۔ اگر کسی نے تمہیں آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو ہم اس کی ماں کی عزت لوٹ لیں گے۔''

''ماں، بہن اور بیٹی۔'' دوسروں نے کہا۔

امام بخش نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور اپنی قمیض کے نچلے حصے سے ناک صاف کی۔

ہم پاکستان کا کیا کریں گے۔ ہم یہاں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں ہمارے آباؤ اجداد تھے۔ ہم تم لوگوں کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہ چکے ہیں۔ امام بخش نیچے بیٹھ گیا۔ میت سنگھ نے اسے اپنے بازوؤں میں لیکر اس سے ہاتھ ملائے اور سسکیاں بھرنے لگا۔ بہت سے اور دوسرے لوگ بھی روئے۔ سب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

نمبردار بولا۔

ہاں تم ہمارے بھائی ہو۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ تم اور تمہارے بچے اور تمہارے پوتے یہاں اس وقت تک رہ سکتے ہیں جب تک تم چاہو۔ اگر کوئی ایک تم سے تمہاری بیوی یا تمہارے بچوں سے بدتمیزی سے بات کرے گا تو تمہارے سر کا ایک بال بھی چھونے سے پہلے ہم سے۔ ہماری بیویوں اور ہمارے بچوں سے نبٹے گا۔ لیکن چچا! ہم بہت تھوڑے ہیں جبکہ پاکستان سے آنے والے اجنبی سکھ اور ہندو ہزاروں کی تعداد میں آ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کریں گے تو اس کا کون ذمے دار ہو گا؟

ہاں۔ دوسروں نے بھی حمایت کی۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تم بالکل ٹھیک ہو لیکن ان مہاجروں کا کیا کریں؟ میں نے سنا ہے کہ کچھ گاؤں کا کئی ہزار سکھوں نے مجمع کی صورت میں محاصرہ کر رکھا ہے۔ سب بندوقوں اور نیزوں سے مسلح ہیں۔ مدافعت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہم بھیڑ بھاڑ سے نہیں ڈرتے۔ ایک نے جلدی سے جواب دیا۔ انہیں آنے

دو۔ ہم انہیں مار مار کر ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ دوبارہ منوں مجرا کی طرف دیکھنے کی جرات نہیں کرسکیں گے۔ کسی نے اس چیلنج کرنے والے کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ امام بخش نے اپنی ناک دوبارہ چڑھائی۔

اب تم ہمیں کیا کرنے کی نصیحت کرتے ہو۔ بھائیو۔ اس نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔

چچا' نمبردار نے بھاری آواز میں کہا۔

میرے لئے یہ کہنا بہت مشکل ہے لیکن جن حالات میں ہم رہ رہے ہیں ان کی نزاکت کو دیکھو۔ میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ پناہ گزینوں کے کیمپ چلے جاؤ۔ جب تک یہ مشکل ٹل نہیں جاتی۔ تم اپنے ساز و سامان کے ساتھ اپنے گھر کو تالا لگا دو۔ جب تک تم واپس نہیں آتے ہم تمہارے مویشیوں کی دیکھ بھال کریں گے۔

نمبردار کے مشورے نے ایک پریشان کن خاموشی پھیلا دی۔ دیہاتیوں نے اپنی سانسیں سنے جانے کے ڈر سے روک لیں۔ نمبردار کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ کوئی اور بات جلدی سے کہہ کر اپنے الفاظوں کے اثر کو زائل کر دے۔

پرسوں تک۔ اس نے دوبارہ زور سے کہنا شروع کیا۔

کسی بھی مشکل کی صورت میں ہم محفوظ مقام سے تمہیں دریا پار کرانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اب چونکہ دو دنوں سے بارش ہو رہی ہے اس وجہ سے دریا کا پانی اونچا ہو گا۔ دریا پار کرنے کیلئے صرف ٹرین اور سڑک کے پل ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے اپنے تحفظ کیلئے یہی بہتر ہے کہ جو میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ چند دنوں کیلئے کیمپ میں پناہ لے لو اور تب ہی تم واپس آ سکتے ہو۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس نے جوش میں دہرایا۔ اگر تم نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہماری طرف سے خوش آمدید جب تک ہم زندہ ہیں ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔

کسی کو بھی نمبردار کے وعدے پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا۔ وہ اپنے سر جھکائے بیٹھے رہے جب تک امام بخش کھڑا نہیں ہوا۔

ٹھیک ہے' اس نے بارعب انداز میں کہا۔

اگر ہم نے جانا ہی ہے تو ہمارے لئے بہتر ہے کہ اپنے بسترے اور ساز و سامان پیک کریں۔ گھر کا سامان سمیٹنے میں ہمیں ایک رات لگ جائے گی۔ اسے بنانے میں ہمارے باپ دادا کے سینکڑوں سال لگے ہیں۔

نمبردار کو اپنے گناہ کا شدت سے احساس ہوا جو کہ اس کے جذبات پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امام بخش کو گلے لگا لیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ گاؤں کے سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے بازوؤں پر گر گئے اور بچوں کی طرح رونے لگے۔ امام بخش نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔

بلبل ہمیشہ گانا نہیں گاتی۔
کنج کی خوشبودار ہوا میں۔
بہار ہمیشہ نہیں رہتی۔
نہ ہی پھولوں کی بہار۔
نہ ہی دورِ حکومت کے مزے ہمیشہ کیلئے ہوتے ہیں۔
انتہائی خوشی کے دنوں میں سورج ڈوبا رہتا ہے۔
دوستی ہمیشہ کیلئے ختم نہیں ہوتی۔
وہ جانتے ہیں کہ زندگی نہیں۔ کون یہ نہیں جانتا۔
وہ جانتے ہیں کہ زندگی نہیں۔ کون یہ نہیں جانتا۔
وہ جانتے ہیں کہ زندگی نہیں۔ کون یہ نہیں جانتا۔

بہت سونے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے دہرایا۔

ہاں۔ چچا امام بخش۔ یہ زندگی ہے۔

امام بخش اور اس کے ساتھیوں نے روتے ہوئے مجلس کو خیر باد کہا۔ دوسرے مسلمان گھروں میں جانے سے پہلے امام بخش مسجد سے ملحقہ اپنے گھر گیا۔ نوراں پہلے ہی

بستر میں تھی۔ دیوار کی طاق میں ایک تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔

نوراں۔نوراں۔ وہ چلایا۔اس نے کندھوں سے نوراں کو ہلایا۔

نوراں اٹھ جا۔

لڑکی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔کیا ہوا ہے؟

اٹھ اور سامان باندھ۔کل صبح ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔

جانا ہے۔ کہاں؟

میں نہیں جانتا۔ پاکستان۔

لڑکی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ اس نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ امام بخش نے ظاہر کیا کہ جیسے اس نے سنا نہ ہو۔

سارے کپڑے ٹرنک میں ڈال اور کھانے پکانے کے عام استعمال کے برتن کسی بوری میں رکھ لے۔ بھینس کیلئے بھی کچھ رکھ لینا۔ ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔

میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ نوراں نے غصے سے کہا۔

تو جانا نہیں چاہتی لیکن وہ تجھے باہر پھینک دیں گے تمام مسلمان کل کیمپ جا رہے ہیں۔

کون ہمیں باہر نکالے گا؟ یہ ہمارا گاؤں ہے۔ کیا ساری پولیس اور سرکار مر چکی ہے؟

بے وقوف مت بن لڑکی۔ وہی کر جو تجھے کہا جاتا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ اور اتنے ہی آ رہے ہیں جو یہاں باقی بچیں گے انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جلدی کر اور سامان باندھ۔ میں جا رہا ہوں اور دوسروں سے بھی کہوں کہ وہ بھی جلدی تیار ہو جائیں۔

امام بخش لڑکی کو بستر پر بیٹھا چھوڑ کر چلا گیا۔ نوراں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ رگڑا اور دیوار کی طرف چل دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ رات باہر گزارتی

تھی اور سب کے سوتے ہوئے ہی وہ واپس آ جاتی تھی۔ لیکن وہ اکیلی یہ نہیں کر سکتی اور پھر بارش ہو رہی تھی۔ مل رہا ہو چکا ہے شاید جگا بھی گھر آ جائے۔ اس نے سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سچ نہیں لیکن امید باقی تھی اور یہ امید اسے کچھ کرنے کیلئے تیار کر رہی تھی۔

نوراں بارش میں باہر نکل گئی۔ وہ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے بہت سے لوگوں کے پاس سے گزری جو اپنے سر اور کاندھوں کو بوری سے ڈھانپ کر جا رہے تھے۔ سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔ بہت سے گھروں میں لیمپ کی مدہم سی روشنی جھلملا رہی تھی۔ کچھ سامان باندھ رہے تھے۔ اور کچھ ان کی مدد کر رہے تھے۔ بہت سے صرف اپنے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ عورتیں فرش پر بیٹھی ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں اور رو رہیں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہر گھر میں کسی کی موت ہو گئی ہو۔

نوراں نے جگا کے گھر کا دروازہ زور زور سے ہلایا۔ دوسری طرف لگی زنجیر کھڑکھڑ کرنے لگی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ سرمئی روشنی میں اس نے غور کیا کہ چٹخنی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے لوہے کی زنجیر کھولی اور اندر چلی گئی۔ جگا کی ماں کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ شاید اپنے ملنے والے کسی مسلمان دوست کے گھر گئی ہو گی۔ وہاں پر کہیں روشنی نہ تھی۔ نوراں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ جگا کی ماں کا اکیلے سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی واپس گھر جانا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ایسا کہ جگا اچانک چلتا ہوا اندر آ جائے گا۔

وہ بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی۔ ایک گھنٹے تک نوراں سرمئی بادلوں کے سائے کو ایک دوسرے کا پیچھا کرتے دیکھتی رہی۔ پھوار پڑنے لگی۔ اور بڑھتے بڑھتے پھوار بارش بن گئی۔ اس نے کچی پگڈنڈی سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ دروازے کے باہر رک گئے۔ کسی نے دروازہ ہلایا۔

کون ہے؟ ایک بوڑھی عورت کی سوالیہ آواز آئی۔

نوراں گھبرا گئی۔ اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

کون ہے۔ بوڑھی عورت نے غصے سے پوچھا۔

تم بولتے کیوں نہیں۔

نوراں کھڑی ہو گئی اور منہ میں کچھ بڑ بڑانے لگی۔

بے بے۔ بوڑھی عورت اندر داخل ہوئی اور جلدی سے اپنے پیچھے سے دروازہ بند کر لیا۔

جگا۔ جگا۔ کیا یہ تو ہے۔ وہ خاموش رہی۔

کیا انہوں نے تجھے چھوڑ دیا؟

نہیں بے بے۔ یہ میں ہوں۔ نوراں۔ چچا امام بخش کی بیٹی۔ لڑکی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

نورو؟ اس وقت تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟ بوڑھی عورت نے غصے سے پوچھا۔

کیا جگا واپس آ گیا ہے۔

تجھے جگا سے کیا مطلب ہے۔ اس کی ماں نے حیرت سے دانت کاپیتے ہوئے پوچھا۔

تو نے ہی اسے جیل بھجوایا ہے۔ تو نے ہی اسے بدمعاش بنایا ہے۔ کیا تیرا باپ جانتا ہے کہ تو آدھی رات کو اجنبیوں کے گھر جاتی ہے؟

نوراں نے رونا شروع کر دیا۔ ہم کل کہیں دور جا رہے ہیں۔

اس بات نے بڑھیا کے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔

تیرا ہم سے کیا رشتہ ہے جو تو ہم سے ملنے آئی ہے۔ تو جہاں جانا چاہتی ہے جا سکتی ہے۔

نوراں نے آخری پتہ پھینکا۔ میں نہیں جا سکتی۔ جگا نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

دفع ہو جا۔ بوڑھی عورت نے نفرت سے کہا۔

تو ایک مسلمان جولاہے کی بیٹی ہو کر ایک سکھ کسان سے شادی کرے گی! دفع ہو جا ورنہ میں جا کر تیرے باپ کو بتاؤں گی۔ اور سارے گاؤں کو بتاؤں گی۔ پاکستان چلی جا! میرے جگا کو اکیلا چھوڑ دے۔

نوراں کو اس کی بات سن کر بہت بوجھ اور دکھ محسوس ہوا۔

ٹھیک ہے بے بے۔ میں چلی جاؤں گی۔ مجھ سے ناراض مت ہو۔ جب جگا واپس آئے تو اسے صرف یہ کہنا کہ میں ست سری کال۔ کہنے آئی تھی۔

لڑکی نے اس کے گھٹنوں کی طرف جھک کر اس کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور رونے لگی۔

بے بے' میں بہت دور جا رہی ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ جب میں یہاں سے جا ہی رہی ہوں تو مجھے تکلیف تو نہ پہنچاؤ۔

جگا کی ماں اپنے چہرے پر کسی قسم کے جذبات لائے بغیر سیدھی کھڑی رہی۔ لیکن اندر سے وہ کچھ کمزور اور نرم ہو گئی تھی۔

میں جگا سے کہہ دوں گی۔

نوراں نے رونا بند کر دیا۔ اس کے بہتے آنسوؤں میں وقفہ آ گیا۔ وہ مسلسل جگا کی ماں پر جھکی رہی۔ اس کا سر جھکتے جھکتے اس کے پاؤں کو چھو گیا۔

بے بے۔

اب تو کیا کہنا چاہتی ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

بے بے۔

بے بے ۔ بے بے۔ تو اور کچھ کیوں نہیں کہتی۔ عورت نے نوراں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

یہ کیا ہے؟

لڑکی نے تھوک اپنے منہ میں ہی نگل لیا۔ بے بے۔ میرے اندر جگا کا بچہ ہے۔ اگر میں پاکستان چلی گئی اور انہیں پتا چل گیا کہ اس کا باپ ایک سکھ ہے تو وہ اسے مار ڈالیں گے۔ بوڑھی عورت نے نوراں کے سر کو دوبارہ اپنے پاؤں کی طرف جھکنے سے روک لیا۔ نوراں نے مضبوطی سے انہیں پکڑ لیا اور دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

کب سے تیرے پیٹ میں پل رہا ہے۔

مجھے بھی ابھی پتا چلا ہے۔ یہ دوسرا مہینہ ہے۔

جگا کی ماں نے نوراں کی اوپر اٹھنے میں مدد کی اور دونوں چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

نوراں نے سسکیاں لینی بند کر دیں۔

میں تجھے یہاں نہیں رکھ سکتی۔ آخر بوڑھی عورت نے کہا۔

مجھے پولیس کی وجہ سے پہلے ہی بہت پریشانی ہے۔ جب یہ سب معاملہ ختم ہو جائے گا اور جگا واپس آ جائے گا تو وہ تجھے لے آئے گا۔ جہاں بھی تو ہو گی۔ کیا تیرا باپ یہ بات جانتا ہے۔

نہیں! اگر اسے پتلا چلا تو وہ میری شادی کسی سے بھی کر دے گا یا مجھے قتل کر دے گا۔ اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

اوہ۔ یہ ریں ریں تو بند کر۔ بوڑھی عورت نے سختی سے کہا۔ تم نے پہلے کیوں نہیں سوچا جب تم دونوں یہ مصیبت مول لے رہے تھے؟ میں تجھے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ جیسے ہی جگا واپس آئے گا وہ تجھے لے آئے گا۔

بے بے۔ اسے بھیجنے میں دیر مت کرنا۔

وہ خود اپنے واسطے جلدی کرے گا۔ ہمارے پاس نہ تو کوئی زیور اور نہ ہی پیسے بچے ہیں۔ جب وہ بیوی چاہے گا وہ تجھے لے آئے گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

ایک مدہم سی امید نوراں میں جاگی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کے پاس گھر ہو اور وہ گھر اس کا ہو۔ چارپائی جس پر وہ بیٹھی تھی۔ بھینس ۔۔ جگا کی ماں سب کچھ اس کا تھا۔ اگر جگا آنے میں ناکام ہو گیا تو پھر وہ خود ہی واپس آ جائے گی۔ وہ ان سے کہہ سکے گی کہ وہ شادی شدہ تھی۔ باپ کے بارے میں سوچ کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کالے بادل اس کی امید کی کرنوں پر چھا گئے ہوں۔ وہ اسے کچھ کہے بغیر چلی جائے گی۔ چاند پھر چمکنے لگا۔ بے بے۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں صبح ست سری کال کہنے آؤں گی۔

ست سری کال۔ میں جاؤں اور سامان باندھوں۔

نوراں جذبات میں آ کر بوڑھی عورت سے گلے ملی۔

ست سری کال۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔ جگا کی ماں کئی گھنٹوں تک چارپائی پر بیٹھی اندھیرے میں گھورتی رہی۔ اس رات منوں مجرا میں زیادہ لوگ نہیں سوئے۔ وہ گھر گھر جا کر ایک دوسرے سے ملے۔ روئے باتیں کیں۔ محبت کی

قسمیں کھائیں۔ ایک دوسرے کو یقین دلایا کہ حالات جلد بہتر ہو جائیں گے۔ وہ کہتے کہ زندگی پہلے کی طرح ہو جائے گی۔

امام بخش مسلمانوں کے گھروں کا چکر لگا کر نوراں کے واپس آنے سے پہلے ہی آ گیا۔ کوئی بھی سامان بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر اس سے اور بھی زیادہ ناراض ہو گیا۔ یہ جوان کیلئے بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ بوڑھے کیلئے۔ وہ ضرور اپنی سہیلیوں سے ملنے گئی ہو گی۔ وہ بوری ڈھونڈنے کیلئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ٹین کے کنستر اور ٹرنک۔ کچھ منٹ بعد نوراں آ گئی۔

کیا تو اپنی سب سہیلیوں سے مل آئی ہے؟ صبح ہونے سے پہلے ہمیں یہ سب کام نبٹانا ہے۔ امام بخش نے کہا۔

تم سو جاؤ بابا۔ میں سب چیزیں رکھ لوں گی۔ زیادہ کام نہیں ہے اور تم ویسے بھی تھک چکے ہو گے۔ اس نے جواب دیا۔

ہاں میں تھوڑا تھک گیا ہوں۔ اس نے اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو کپڑے باندھ لے۔ ہم کھانے پینے کے برتن صبح رکھ لیں گے۔ جب تو راستے کیلئے صبح کچھ پکا لے گی۔ امام بخش بستر پر لیٹا اور سو گیا۔

نوراں کیلئے کرنے کو زیادہ کام نہ تھا۔ ایک پنجابی کسان کا ساز و سامان تھوڑے سے کپڑے ایک رضائی۔ ایک تکیہ' منکوں کی ایک جوڑی۔ کھانے پینے کے عام استعمال کے برتن اور غالباً ایک پیتل کی پلیٹ۔ ایک تانبے کا گلاس یادو۔ یہ سب سامان ایک فرنیچر پر رکھا جا سکتا ہے۔ جو ان کے پاس تھا یعنی ایک چارپائی۔ نوراں نے اپنے اور اپنے باپ کے کپڑے اسٹیل کے سرمئی ٹرنک میں رکھے جو ان کے پاس تب سے تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس نے صبح کیلئے روٹیاں پکانے کے واسطے چولہا جلایا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے پکانے کا کام ختم کر لیا۔ اس نے برتنوں کو کھنگالا اور انہیں بوری میں رکھ دیا۔ آٹا' نمک اور مصالحے جو بچ گئے تھے اس نے بسکٹ اور سگریٹ کے ڈبوں میں رکھ دیئے جو کہ لکڑیاں جلانے میں اپنی باری سے بچ گئے تھے۔ سامان بندھ گیا۔ اس نے اس سب کو گول تکیے کی مانند بنا دیا اور یہ سامان چارپائی پر اور چارپائی بھینس پر رکھی جائے گی۔ جبکہ

ٹوٹا ہوا آئینہ اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر لے جا سکتی ہے۔ تمام رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی جو صبح ہوتے ہی موسلا دھار بارش میں بدل گئی۔ گاؤں والے جو ساری رات جاگتے رہے تھے۔ مون سون کی بارش کی ٹپ ٹپ کی آواز میں سو گئے صبح کی تازہ ٹھنڈی ہوا میں جیسے خواب آور گولیاں مل گئی ہوں۔

فوجی موٹر کار کے ہارن کی پوں پوں اور ٹرک کے انجن کی گھڑ گھڑ کے ساتھ کیچڑ اور کچے راستے میں سے راستہ ڈھونڈتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے ان کی رہنمائی کرنے والے منوں مجرا میں چوڑی پگڈنڈی کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگے تاکہ ٹرک اندر داخل ہو سکے۔ آگے ایک جیپ تھی جس میں لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا۔ اس میں دو آفیسرز ایک سکھ اور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ کے پیچھے ایک درجن ٹرک تھے۔ ایک ٹرک پٹھان سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا سکھوں سے۔ وہ سب اسٹین گنوں سے مسلح تھے۔

رہنما گاؤں کے باہر ہی رک گئے۔ صرف جیپ اپنا راستہ بناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ درمیان میں پیپل کے درخت کے نیچے پلیٹ فارم کے ساتھ آ کر رک گئی۔ سکھ نے ایک دیہاتی سے کہا کہ وہ نمبردار کو لے کر آئے۔ مسلمان پٹھان سپاہیوں سے ملنے لگے اس نے انہیں دستے کی صورت میں سب کے دروازے کھٹکھٹانے کیلئے بھیجا اور کہا کہ مسلمانوں سے کہو کہ وہ باہر آ جائیں۔ کچھ منٹ بعد منوں مجرا ان لاؤڈ سپیکر کی ان آوازوں سے گونجنے لگا۔

''پاکستان جانے والے تمام مسلمان فوراً باہر آ جائیں۔ تمام مسلمان' جلدی باہر نکلیں۔''

آہستہ آہستہ تمام مسلمان اپنے گھروں سے باہر آنا شروع ہو گئے انہوں نے مویشیوں اور اپنے بیلوں کی جوڑیوں کے اوپر بوریا بستر سمیت چارپائیاں لادی ہوئی تھیں۔ ٹین کے ٹرنک' مٹی کے تیل کے ڈبے' مٹکے اور پیتل کے عام استعمال کے کھانے پینے کے برتن بھی لدے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ منوں مجرا کے باقی لوگ مسلمانوں کو گاؤں چھوڑتا دیکھنے کیلئے باہر آ گئے۔ دونوں آفیسرز اور نمبردار آخر میں گاؤں سے باہر نکلے۔ جیپ ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ باتیں کر رہے تھے اور اشاروں میں بحث بھی کر

رہے تھے۔ زیادہ گفتگو نمبردار اور مسلمان فوجی آفیسر کے درمیان ہو رہی تھی۔ مسلمان فوجی افسر نے کہا میرے پاس یہ سب ساز و سامان' بیلوں کی جوڑیاں' چھکڑے' بستر برتن اور توا کڑھائی لے جانے کا انتظام نہیں ہے۔ ہم سڑک کے راستے پاکستان نہیں جا رہے بلکہ ہم آپ کو چندن نگر کے مہاجر کیمپ لے جائیں گے۔ اور آپ وہاں سے ٹرین کے ذریعے پاکستان جائیں گے۔ وہ صرف اپنے کپڑے' بستر کیش اور زیور لے جا سکتے ہیں۔ ان سے کہو کہ سب چیزیں یہیں چھوڑ دیں۔ تم ان کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔ یہ خبر کہ منوں مجرا کے مسلمانوں کو پاکستان لے جایا جا رہا ہے سب کیلئے حیران کن تھی کیونکہ نمبردار نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ صرف چند دنوں کیلئے مہاجر کیمپ جائیں گے اور پھر واپس آ جائیں گے۔

نہیں۔ صاحب۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ نمبردار نے جواب دیا۔

اگر ایک دو دن کی بات ہوتی تو ہم ان کے ساز و سامان کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ اب جیسا کہ آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ انہیں واپسی میں کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔ جائیداد ایک بری چیز ہے یہ انسانوں کیلئے زہر ہے۔ نہ' ہم کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ہم صرف ان کے گھروں کی دیکھ بھال کریں گے۔

مسلمان افسر کو غصہ آ گیا۔ میرے پاس بحث کیلئے وقت نہیں ہے۔ تم خود بھی دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس صرف ایک درجن ٹرک ہیں۔ میں اس میں بھینس اور بیل گاڑی نہیں رکھ سکتا۔

نہ صاحب۔ نمبردار نے ضدی کی طرح ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

آپ جو چاہتے ہیں خود کہہ سکتے ہیں' آپ ہم سے ناراض بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہم اپنے بھائیوں کی جائیداد کو ہاتھ نہیں لگائیں گے آپ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے دشمن بن جائیں؟

واہ۔ واہ۔ نمبردار صاحب۔ مسلمان افسر نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

شاباش۔ کل تم ان مسلمانوں کو مارنا چاہتے تھے۔ آج تم انہیں اپنا بھائی کہہ رہے ہو۔ کل تم دوبارہ اپنا ذہن بدل لو گے۔

آپ ہم پر اس طرح طنز نہ کریں۔ کیپٹن صاحب ہم بھائی ہیں اور ہمیشہ بھائی ہی رہیں گے۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے نمبردارا۔ تم بھائی ہو۔ افسر نے اپنی جان چھڑائی۔ میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں لیکن میں اب بھی ان فضول چیزوں کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ تم اپنے سکھ افسر سے اور اپنے گاؤں کے ساتھیوں سے اس کے بارے میں پوچھ لو۔ میں مسلمانوں سے پوچھ لوں گا۔

مسلمان افسر جیپ پر چڑھا اور مجمع سے مخاطب ہوا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں بول رہا تھا۔

ہمارے پاس ایک درجن ٹرک ہیں اور آپ سب لوگ جو پاکستان جا رہے ہیں۔ ان ٹرکوں میں دس منٹ میں چڑھ جائیں۔ اس کے بعد ہمیں دوسرے گاؤں کو بھی خالی کرانے جانا ہے۔ ساز و سامان جتنا آپ خود اٹھا سکتے ہیں اٹھا لے کر جائیں۔ زیادہ نہیں۔ آپ اپنے مویشی بیل گاڑیاں۔ چارپائیاں' مٹکے اور جو کچھ آپ کے دوستوں کے پاس گاؤں میں ہے سب یہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ اگر ہمیں موقع ملا تو ہم بعد میں یہ سب چیزیں آپ کیلئے لے آئیں گے۔ میں آپ لوگوں کو دس منٹ دیتا ہوں آپ اپنا ضروری سامان لے لیں اور باقی چیزیں یہیں چھوڑ دیں۔ اس کے بعد مسلح حفاظتی دستہ چل پڑے گا۔

مسلمانوں نے اپنے بیل۔ چھکڑے اور دوسری چیزیں وہیں چھوڑ دیں اور جیپ کے گرد کھڑے ہو کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ مسلمان افسر جو کہ جیپ سے اتر چکا تھا۔ دوبارہ مائیکروفون کے پاس گیا۔

خاموش ہو جائیں! میں آپ کو خبردار کرتا ہوں۔ حفاظتی دستہ دس منٹ میں چل پڑے گا چاہے آپ اس پر سوار ہوں یا نہ ہوں۔ یہ میری ذمے داری نہیں ہوگی۔

سکھ کسان جو کہ دور کھڑے ہو کر یہ اعلان سن رہے تھے سکھ افسر کے پاس مشورے کیلئے گئے۔ لیکن افسر نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ مسلسل حقارت سے اپنی برساتی کے بغیر مڑے ہوئے کالر سے آدمیوں' مویشیوں' بیل گاڑیوں اور بارش اور کیچڑ

میں کھڑے ٹرک کو دھواں چھوڑتے دیکھتا رہا۔

کیوں۔ سردار صاحب۔ میت سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

کیا نمبردار ٹھیک نہیں کہہ رہا؟ ہمیں دوسروں کی جائیداد کو چھونا نہیں چاہیے۔ یہ غلط فہمی ہمیشہ خطرے کا باعث بنتی ہے۔

آفیسر نے میت سنگھ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی جی۔ غلط فہمی کا خطرہ رہتا ہے ایک کو دوسرے کی جائیداد کو چھونا نہیں چاہیے۔ ایک کو دوسری کی عورت پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔ کسی ایک کو دوسروں کو اپنی چیزیں لے جانے کی اور کسی ایک کی بہن کے ساتھ سونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنی چیزیں ان لوگوں کو دے جائیں جو آپ کو پسند کرتے ہیں۔ کیا آپ کے سامنے آپ کی ماں۔ بہنوں کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ کیا آپ کے کپڑے اتارے گئے ہیں اور آپ کو ٹھوکر مار کر واپس بھیجا گیا ہے اور آپ کے پیچھے آپ پر تھوکا گیا ہے۔

افسر کی یہ تقریر سب کسانوں کے منہ پر تھپڑ لگنے کے مانند تھی۔ لیکن چند ایک چپکے چپکے ہنس بھی رہے تھے۔ ہر کوئی دیکھنے کیلئے مڑا۔ یہ ملی تھا اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ۔ ان کے ساتھ چند جوان مہاجر بھی تھے جو کہ گردوارے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا منوں مجرا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سر۔ اس گاؤں کے لوگ اپنی سخاوت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ملی نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو دوسروں کی حفاظت کیسے کریں گے؟ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سردار صاحب۔ ہم مسلمانوں کی جائیدادوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ آپ اپنے دوسرے آفیسرز سے کہہ دیں کہ یہ ہمارے لئے چھوڑ جائیں۔ یہ بالکل محفوظ رہے گی اگر آپ اپنے کچھ سپاہیوں کو یہاں ان کی حفاظت کیلئے مقرر کر سکیں تاکہ سکھ مہاجروں کو لوٹنے سے روکا جا سکے۔

یہ بات مکمل طور پر پریشانی کا باعث تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو چیختے پکارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تب ہی مسلمان افسر

کی فیصلہ کن آواز آئی۔ گاؤں والے شور مچانے اور چیختے چلاتے اس کے گرد جمع ہو گئے اور اپنے مشورے دینے لگے۔ وہ اپنے سکھ ساتھی کے پاس آیا جو کہ اپنے سکھ ہم مذہبوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ کیا آپ نے مسلمانوں کی چھوڑی جانے والی چیزوں کو سنبھالنے کا کوئی انتظام کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ سکھ افسر جواب دے پاتا۔ ہر طرف سے احتجاج شروع ہو گیا۔ لیکن سکھ افسر اپنا منہ بند کئے علیحدہ کھڑا رہا۔ مسلمان افسر تیزی سے واپس مڑا اور زور سے چلایا۔ خاموش ہو جاؤ۔ شور وغل کم ہو گیا۔ وہ ایک ایک لفظ رموز و اوقاف لگاتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

میں آپ لوگوں کو پانچ منٹ دیتا ہوں آپ جلدی سے اپنا سامان جتنا آپ اپنے ہاتھوں میں اٹھا سکیں لے کر ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ جو سوار نہیں ہوں گے انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ اور میں یہ آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں۔ سب انتظام ہو گیا ہے سکھ افسر نے آہستہ سے پنجابی میں کہا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے دوسرے گاؤں کے لوگ ان چھکڑوں، مویشیوں اور گھروں کی حفاظت کریں گے۔ میں سامان کی لسٹ بنا لوں گا اور تمہیں بھیج دوں گا۔ اس کے ساتھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر تمسخر آمیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ منوں مجراں کے سکھ اور مسلمان بے بس نظر آ رہے تھے۔ یہاں پر انتظامات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں تو خدا حافظ کہنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ پٹھان سپاہیوں نے مسلمانوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور انہیں ان کی بیل گاڑیوں سے ایک یا دو منٹ میں اتار لائے اور پھر ٹرک میں بیٹھا دیا۔

بارش اور کیچڑ کی وجہ سے اور بھی پریشانی ہو رہی تھی سپاہی کسانوں کے جانوروں کو اپنی اسٹین گن کی نالیوں سے مار رہے تھے۔ گاؤں والوں نے لمحہ بھر کیلئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ٹرک کو آخری مرتبہ الوداع کہا۔

مسلمان افسر نے جب دیکھا کہ سب سوار ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی جیپ کو مسلح حفاظتی دستے کے ساتھ آگے بڑھایا اور پھر اپنے سکھ ساتھیوں کو خدا حافظ کہنے آیا۔ دو ہاتھ مشین کی طرح ایک دوسرے سے بغیر کسی مسکراہٹ یا جذبے کی عکاسی کے ملے۔ جیپ نے ٹرک کی قطار کے آگے اپنی جگہ سنبھال لی۔ مائیکروفون نے بگل کی آواز نکال کر چوتھی

دفعہ اعلان کیا کہ وہ جانے کیلئے تیار ہیں۔

افسر نے نعرہ لگایا۔ پاکستان۔

اس کے سپاہیوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

زندہ باد!

مسلح حفاظتی دستے نے کیچڑ میں چندن نگر کا راستہ لیا۔ سکھ انہیں اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے چہروں سے آنسو صاف کئے اور دل پہ بھاری بوجھ لئے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔ منوں مجراں کے دکھوں کا پیالہ ابھی تک بھرا نہیں تھا۔ سکھ افسر نے نمبردار کو طلب کیا۔ سارے گاؤں والے اس کے ساتھ آئے۔ کوئی بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ سکھ سپاہیوں نے ان کے گرد حفاظتی گھیرا ڈال لیا۔ آفیسر نے گاؤں والوں سے کہا کہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ملی کو مسلمانوں کی متروکہ جائیداد کا انچارج بنا دے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑے گا یا مداخلت کرے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

ملی کے گینگ نے اپنا کام شروع کر دیا سکھ مہاجرین نے بیلوں کو جوئے سے الگ کر دیا۔ چھکڑوں پر لدا سامان لوٹ لیا گیا اور وہ گائے اور بھینسوں کو دور کہیں لے گئے۔

O

گرما

اس صبح سب لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے کھلے دروازوں سے مایوسی سے باہر دیکھتے رہے انہوں نے دیکھا کہ ملی کے آدمیوں اور سکھ مہاجرین نے مسلمانوں کے گھروں کی کونے کونے کی تلاشی لی۔ انہوں نے مویشیوں کی دردناک آوازیں سنی جیسے کہ وہ انہیں مار رہے ہوں۔ انہوں نے مرغیوں کی بھی کٹ کٹ کٹاک کی آوازیں سنی اور چاقو سے مرغے کو کاٹنے کی آواز سنی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا صرف بیٹھ کر ٹھنڈی سانسیں لیتے رہے۔

ایک گڈریا لڑکا جو کہ باہر مشروم ڈھونڈنے گیا تھا۔ یہ خبر لیکر واپس آیا کہ دریا چڑھ رہا ہے۔ کسی نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ دریا مزید چڑھے اور پورا منوں مجراں ان کے۔ ان کی عورتوں' بچوں اور مویشیوں سمیت ڈوب جائے بشرطیکہ ملی اس کا گینگ سکھ مہاجرین اور سکھ سپاہی بھی ڈوب جائیں۔

ان لوگوں نے ٹھنڈی سانسیں لیں اور کراہنے لگے۔ بارش لگاتار برستی رہی ستلج مسلسل چڑھتا رہا اس نے ایک طرف پھیل کر درمیانی حصے کو اپنی گود میں لے لیا۔ جو کہ عموماً سردیوں میں اس حد تک جاتا تھا اور قریبی قدرتی تالاب ایک بڑی ندی میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ یہ پل کے دائیں طرف پھیلتا ہوا ڈیم کو چھو لیتا جو کہ منوں مجراں کے کھیتوں سے اسے الگ کرتا تھا۔

یہ ایسے جزیروں سے ہوتا ہوا دریا میں گرتا ہے اس میں اگنے والی جھاڑیاں

دیکھی جا سکتی ہیں۔

دوپہر کو ایک اور دیہاتی چیختا ہوا ان کے گھروں کے قریب آیا "اوہ بنتا سنگھ۔ دریا چڑھ رہا ہے' دلیپ سنگھا' دریا چڑھ رہا ہے۔ اوئے سنو۔ یہ پہلے ہی ڈیم سے اوپر چڑھ چکا ہے۔ لوگوں نے اپنی غمگین نگاہوں سے اشارے کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

ہم پہلے ہی یہ سب سن چکے ہیں۔

اتنے میں ایک اور آدمی یہ ہی پیغام لیکر آیا کہ دریا چڑھ گیا ہے۔

پھر دوسرا اور تیسرا یہاں تک کہ سب نے کہنا شروع کر دیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ دریا چڑھ گیا ہے۔

آخر کار نمبردار خود دیکھنے کیلئے گیا۔ ہاں۔ دریا چڑھ چکا تھا۔ اس کی وجہ دو دن سے ہونے والی بارش نہ تھی بلکہ یہ پہاڑوں سے پگھلنے والی برف کی وجہ سے چڑھا تھا۔ نہر کے بند کا بڑا دروازہ غالباً سیلاب کو اس کے کناروں سے باہر نکلنے سے بچا سکتا تھا۔ بہتی ہوئی سرمئی ندی آہستہ آہستہ خطرناک بن چکی تھی اور گدلی کچی مٹی کو درہم برہم کرتی ہوئی ہر طرف پھیل چکی تھی۔

پل کی گودیاں ابھی تک سخت تھیں اور بڑے فخر سے دریا کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ پانی کی چادر میں ان کے پوائنٹ کے کنارے آرام سے سکون سے تھے۔ اور اس کو اپنے اظہار کی اجازت دے رہے تھے کہ وہ اپنے غصے کا اظہار' چکر بھنور اور گرداب کی صورت میں کر دیں۔ بارش سطح پر چیچک کے داغوں کی مانند گر رہی تھی۔ ستلج ہولا دینے والا نظارہ پیش کر رہا تھا۔

شام تک منوں مجراں ملی کے جرائم کے بارے میں بھول چکا تھا۔ دریا گفتگو کا اہم موضوع بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ عورتیں اپنی چھتوں پر چڑھ کر مغرب کی جانب دیکھنے لگیں۔ کسان اپنی اپنی باری پر دریا کی صورت حال کی رپورٹ دینے کیلئے اس کے کناروں پر جانا شروع ہو گئے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے نمبردار پھر دریا دیکھنے کیلئے گیا۔ دوپہر کے مقابلے میں دریا مزید اوپر چڑھ گیا تھا۔ پمپاس کے کچھ خوشے جو کہ پانی پر تیر رہے تھے وہ

اب مکمل طور پر غرق ہو گئے تھے۔ ان کی ڈنڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کے برف جیسے سفید سجاوٹی پر پانی میں تیر رہے تھے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اتنے کم وقت میں ستلج اتنا اوپر چڑھ جائے گا۔ منوں مجراں کا طویل راستہ اب بھی موجود تھا اور گیلا ڈیم مضبوط اور محفوظ نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے رات بھر دریا کی پوزیشن دیکھنے کیلئے انتظامات کئے۔ تین تین آدمیوں کی چار پارٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ سورج غروب ہونے سے سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے رہے گا اور ہر گھنٹے بعد رپورٹ کرے گا۔ باقی اپنے گھروں میں رہیں گے۔

نمبردار کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا اس طرح سے گاؤں تحفظ کے احساس کے ساتھ سکون سے سو سکتا تھا۔ نمبردار خود بھی بہت کم سویا تھا۔

آدھی رات کے بعد نگرانی کرنے والے تینوں آدمی زور زور سے چیختے ہوئے گاؤں کی طرف واپس بھاگے۔ نگرانی پر مامور لوگوں نے انسانوں کی آوازیں سنی تھیں جو مدد کیلئے پکار رہے تھے۔ چیخوں کی آوازیں پانی میں سے آ رہی تھیں۔ وہ دوسرے کنارے سے بھی آ سکتی تھیں یا دریا میں سے آ رہی تھی۔ کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔ ان کی آوازیں سن کر نمبردار ان کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے اپنی کرومیم ٹارچ بیٹری لے لی۔ چار آدمی کنارے پر کھڑے ستلج کا جائزہ لے رہے تھے جو کہ ایک کالی چادر کی مانند لگ رہا تھا۔ نمبردار کے ٹارچ کی سفید شعاع نے دریا کی سطح کو روشن کر دیا۔ لیکن وہ سوائے پانی کے بھنور کے کچھ نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اپنی سانسیں روک لیں اور غور سے سننے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بارش کے پانی پر گرنے کی ٹپ ٹپ آوازوں کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ ہر مرتبہ نمبردار پوچھتا کہ کیا انہیں یقین ہے کہ جو آوازیں انہوں نے سنی تھیں وہ انسانوں کی تھیں اور گیدڑوں کی نہیں۔ ان کی غیر یقینی کیفیت بڑھتی گئی اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ صاف تھی۔ یا آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔ اوہ ہاں۔ یہ کافی صاف آوازیں تھیں جیسے کوئی بہت تکلیف میں ہو۔ چاروں آدمی درخت کے نیچے طوفان باد و باراں سے بچنے کیلئے لیمپ کے گرد گھٹنے گلے سے لگا کر بیٹھ گئے۔ بوری جو کہ انہوں نے برساتی کے طور پر استعمال کی

تھی پانی جذب کر کے گیلی ہو چکی تھی اس لئے ان کے کپڑے بھی گیلے ہو گئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد بادل زور سے گرجے۔ بارش کم ہو کر پھوار میں بدل گئی اور پھر رک گئی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں سے تقریباً مغربی افق کی طرف سے نکلا دریا پر پڑنے والے اس کے عکس نے ایک ٹمٹماتا ہوا راستہ بنا دیا درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے آدمیوں کی مخالف سمت چلتے ہوئے چاند کی اس روشنی میں چھوٹی چھوٹی اٹھنے والی پانی کی لہریں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ ایک کالی بیضوی شکل کی چیز پل کے ستون سے ٹکرائی اور تیرتی ہوئی منوں مجرا کے کنارے کی طرف چلی گئی۔ یہ ایک بڑے ڈرم کی مانند اپنے اطراف میں چھڑیاں لگائے ہوئے تھیں۔ یہ چیز کبھی آگے جاتی اور کبھی پیچھے اور کبھی اطراف میں یہاں تک کہ کنارے پر بیٹھے ہوئے کسانوں کے پاس آ گئی۔ یہ ایک مری ہوئی گائے تھی جس کا پیٹ ایک بڑے روشن دان کی مانند پھولا ہوا تھا اور اس کی ٹانگیں اکڑ کر اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ تب اس کے پیچھے ایک گھاس پھوس کا چھپڑ اور کپڑوں کی ایک گٹھڑی آ گئی۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی گاؤں سیلاب میں بہہ گیا ہو۔

نمبردار نے کہا۔

چپ کر کے سنو۔ ایک دیہاتی نے سرگوشی میں کہا۔

پانی میں سے غشی کی حالت میں کسی کی کراہنے کی آواز آئی۔

کیا تم نے سنا؟

چپ رہو۔

انہوں نے اپنی سانسیں روک لیں اور دوبارہ سننے کی کوشش کی۔ نہیں۔ یہ انسان کی آواز نہیں ہو سکتی۔ یہ رگڑ کی آواز ہے۔ انہوں نے دوبارہ سنا۔ یقیناً یہ رگڑ کی آواز ہے۔ یہ ٹرین تھی۔ اس میں سے نکلنے والی آواز صاف سے صاف تر ہوتی گئی۔ اتنے میں انہوں نے انجن کا سامنے کا حصہ دیکھا اور پھر ٹرین خود آ گئی۔ اس میں کوئی لائٹ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس انجن کی ہیڈ لائٹ بھی نہیں تھی۔ چنگاریاں انجن میں سے ایسے نکل رہی تھیں جیسے کہ آگ کا کام ہو رہا ہو۔

ٹرین منوں مجرا کے پاس آ کر رک گئی یہ پاکستان سے آئی تھی۔ ٹرین میں کوئی

بھی لائٹ نہیں ہے۔

انجن نے سیٹی بھی نہیں بجائی۔

یہ تو بھوت کی مانند ہے۔

خدا کا نام لو اور اس طرح کی باتیں مت کرو۔ نمبردار نے کہا۔

ہو سکتا ہے یہ مال گاڑی ہو یہ اسی کا سائرن ہو جو تم نے سنا تھا۔ یہ نئے امریکی انجن ایسی دردناک آوازیں نکالتے ہیں جیسے کسی کا قتل ہو رہا ہو۔

نہیں نمبردار۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے آواز سنی تھی اور ایسی ہی دوبارہ ٹرین کے آنے سے پہلے سنی تھی۔ ایک دیہاتی نے جواب دیا۔

تم یہ آوازیں اب دوبارہ سن سکتے ہو کیونکہ ٹرین اب کسی قسم کی آواز نہیں نکال رہی۔

ریلوے لائن سے پرے جہاں چند دن پہلے ہزاروں لاشیں جلائی گئی تھیں۔ ایک گیدڑ بیٹھا دردناک چیخوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ شکاری کتوں ایک کی ٹولی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لوگ خوف سے کانپ گئے۔

ضرور گیدڑ کی آوازیں ہوں گی۔ اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی عورت کسی کے مرنے پر چیختی ہے۔ نمبردار نے کہا۔

نہیں نہیں۔ کسی دوسرے نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔ نہیں یہ تو انسانی آواز تھی اور اتنی ہی صاف تھی جیسے کہ آپ اس وقت مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔

وہ بیٹھ گئے اور سننے لگ اور سیلاب کے پانی میں نمایاں ہو کر تیرنے والی عجیب چیزوں کو دیکھنے لگے۔ چاند ڈوب گیا تھا۔ تھوڑے سے اندھیرے کے بعد مشرقی افق سرمئی میں تبدیل ہو گیا۔

چمگادڑوں کی ایک لمبی قطار بغیر آواز نکالے خاموشی سے ادھر ادھر اڑنے لگی۔

کوے اپنے ٹھکانوں پر چیخنے لگے۔ کوئل کی آواز درخت کی شاخ کو پھاڑتی ہوئی آئی اور ساری دنیا جاگ گئی۔

بادل اپنے آپ کو لپیٹ کر شمال کی طرف چلے گئے۔ آہستہ آہستہ سورج نمودار

ہوا۔ ہر چیز سورج کی روشنی میں چمکنے لگی۔ دریا اور اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس کا گدلا پانی اپنے ساتھ چھکڑے لایا جس میں اب تک مرے ہوئے بیلوں کی جوڑی پھولے ہوئے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ گھوڑے ساتھ ساتھ لپٹتے ہوئے ایسے آ رہی تھے جیسے کہ ان کی کمر پر چوٹیں آ گئی ہوں۔ وہاں پر بہت سے مرد اور عورتیں اپنے کپڑوں کو اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے تھے۔ چھوٹے بچے بازوؤں کو مضبوط سے پکڑے ان کے پیٹوں پر سو رہے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کولہے کبھی پانی میں ڈوبتے اور کبھی باہر نکلتے۔ آسمان جلد ہی گدھوں سے بھر گیا۔ وہ نیچے آتے اور پانی میں اتر کر مردار کھا لیتے۔ وہ اس وقت تک ٹھونگیں مارتے رہے جب تک کہ لاشیں خود اوپر نہ آ گئیں اور ان کو ہاتھوں سے شوشو کر کے اڑایا گیا جو کہ بڑی مشکل سے ہوا میں اڑتے اور دوبارہ پانی میں چھینٹے اڑاتے آ گئے۔

کچھ گاؤں ضرور رات میں سیلاب کی نظر ہو گئے ہیں۔ نمبردار نے سنجیدگی سے کہا۔

رات میں کون بیلوں کو چھکڑوں میں جوئے گا۔ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

ہاں۔ یہ سچ ہے۔ رات میں بیلوں کی جوڑی کو کیوں جوتا گیا؟

بہت سی انسانی صورتیں پل کے محراب سے دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ ستون سے اچٹتیں۔ ذرا دیر رکتیں اور پھر گرداب کی طرح گھومتی رہتیں۔ اور اچٹتے اچٹتے دریا میں گر جاتیں۔ آدمی لاشوں کو دیکھنے کیلئے پل کی طرف گئے جو کہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ دریا کے کنارے آ گئی تھیں۔

وہ کھڑے ہو گئے اور غور سے دیکھنے لگے۔

نمبردارا۔ وہ غرق نہیں ہوئے تھے۔ وہ قتل ہوئے تھے۔

ایک بوڑھا کاشتکار اپنی سرمئی داڑھی کے ساتھ پانی پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے اپنے بازو باہر کو پھیلے ہوئے تھے جیسے کہ اسے صلیب پر چڑھایا گیا ہو۔ اس کا منہ کافی کھلا ہوا تھا اور اس کے بغیر دانتوں کے مسوڑھے دکھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کے بال اس کے سر کے گرد ہالے کی مانند تیر رہے تھے۔ اس کی گردن پر گہرا زخم تھا جو کہ اس کے سینے کے ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایک بچے کا سر

بوڑھے آدمی کے بازوؤں میں دبا ہوا تھا۔ اس کی پچھلی طرف سوراخ ہو چکا تھا۔ وہاں پر اور بھی بہت سے پہاڑوں پر سے کٹی ہوئی (درخت کی) گیلی لکڑی کی مانند دریا میں گرتے ہوئے آ رہے تھے۔

کچھ بغیر بازو یا ٹانگ کے تھے۔ کچھ کے پیٹ پھٹ چکے تھے۔ بہت سی خواتین کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ وہ سورج کی روشنی تلے دریا میں تیر رہے تھے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ان کے اوپر پتنگیں اور گدھ اشتیاق سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

نمبردار اور دوسرے دیہاتیوں نے اپنی پگڑیوں کے آخری حصے کو اپنے منہ پر لپیٹ لیا۔

گرو ہم پر رحم کرے۔ کسی نے سرگوشی میں کہا۔

کہیں پر قتل عام ہوا ہے ہمیں ضرور پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔

پولیس؟ ایک چھوٹے قد کے آدمی نے تلخی سے کہا۔

وہ کیا کریں گے۔ پہلے صرف پہلی اطلاع کی رپورٹ لکھیں گے۔

پارٹی دکھی اور بھاری دل کے ساتھ منوں مجرا واپس لوٹ آئی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ واپس جا کر لوگوں کو کیا کہیں گے۔

دریا مزید اوپر چڑھ گیا ہے؟ کس گاؤں میں سیلاب آیا تھا؟ کہیں پر قتل عام ہوا تھا یا ستلج پر سینکڑوں لاشیں تیر رہی ہیں۔ یا وہ صرف چپ رہیں۔

جب و. گاؤں واپس آئے تو کوئی بھی ان سے کچھ سننے والا نہ تھا۔ وہ سب چھتوں پر چڑھے اسٹیشن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کئی دنوں بعد دن کے وقت کوئی ٹرین منوں مجرا آ کر رکی تھی۔ تب سے ہی انجن کا منہ مشرق کی جانب تھا۔ یہ ضرور ادھر سے آئی تھی۔ اس بار بھی جگہ پولیس اور سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی اور اسٹیشن کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ دریا پر لاشوں کے تیرنے کی خبر گھروں کی چھتوں پر سے چلا چلا کر بتائی گئی۔ لوگ ایک دوسرے سے عورتوں اور بچوں کے ہاتھ پیر کاٹنے کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی بھی یہ نہیں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مرے ہوئے لوگ کون تھے۔ اور نہ ہی انہیں دیکھنے کیلئے دریا پر جانا چاہتا تھا۔ پچھلی دفعہ کی نسبت خوف و ہراس کی وجہ سے اسٹیشن پر اور بھی زیادہ دلچسپی

بڑھ گئی تھی۔ کسی کے ذہن میں یہ شک نہ تھا کہ ٹرین کس پر مشتمل ہے۔ انہیں یقین تھا کہ سپاہی زرور تیل اور لکڑی لینے آئیں گے۔ ان کے پاس نہ تو زائد تیل تھا اور نہ لکڑی جو لکڑی ان کے پاس بچی ہوئی تھی بہت زیادہ سیلن والی تھی۔ لیکن سپاہی لکڑی لئے نہ آئے۔

ان کے بجائے ایک بلڈوزر کہیں سے آ گیا۔ اس نے اپنے منہ کے جبڑے سے زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔ صرف منوں مجراں کے اسٹیشن کے باہر کی طرف یہ ساتھ ساتھ زمین کو کھودتا۔ اس کو ہلاتا اور ایک طرف پھینک دیتا۔ یہ کئی گھنٹوں تک یہی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پچاس گز لمبی مستطیل اجتماعی قبر کھد گئی ساتھ ہی زمین کے ایک طرف ٹیلا بن گیا۔ پھر وہ تھوڑے وقفے کیلئے رک گیا۔ فوجی اور پولیس والے جو کہ سستی سے بلڈوزر کو کام کرتا دیکھ رہے تھے۔ انہیں حکم دیکر بلایا گیا وہ پلیٹ فارم کی طرف دوبارہ مارچ کرتے ہوئے چلے گئے۔ یہ سلسلہ سورج غروب ہونے تک چلتا رہا۔ تب ہی بلڈوزر دوبارہ سے جاگ گیا۔ اس نے اپنا جبڑا کھولا اور زمین کھود کھود کر کھانے لگا۔ جب لاشیں اجتماعی قبر میں ڈال دی گئیں تو بلڈوزر نے دوبارہ سے اس پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ جب تک کہ وہ گڑھا زمین کے برابر ہموار نہ ہو گیا۔ جگہ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی زخمی کے ٹھیک ہو جانے کے بعد صرف زخم کا نشان رہ جاتا ہے۔ دو سپاہی گیدڑوں اور بچھوؤں سے ان قبروں کو بچانے کیلئے وہاں پر حفاظت کی خاطر چھوڑ دیئے گئے۔

اس شام سارا گاؤں شام کی پوجا کیلئے گردوارے میں جمع ہوا۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سوائے گرو کی سالگرہ والے دن یا اپریل میں نئے سال کے دن پر۔ باقاعدگی سے مندر آنے والوں میں صرف بوڑھے آدمی اور عورتیں شامل تھیں۔ دوسرے کبھار اپنے بچوں کے نام رکھنے کی خاطر یا شادی بیاہ اور جنازے کی وجہ سے آتے تھے۔ زمیندار کے قتل کے بعد سے یہ پوجا باقاعدگی سے ہونے لگی تھی۔ لوگ اکیلے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ جب سے مسلمان گئے تھے ان کے بیاباں گھروں کے کھلے دروازے اور بھی ہیبت پھیلا رہے تھے۔ گاؤں والے ان گھروں کے پاس سے بہت تیزی سے بغیر مڑے گزر جاتے تھے۔ گردوارہ ہی پناہ گزینوں کی وہ واحد جگہ تھی جہاں لوگ بغیر کسی سوال و جواب کے بآسانی جا سکتے تھے۔ مرد جھوٹ بولتے کہ انہیں عورتوں کی ضرورت ہو گی اس

لیے وہ بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اور وہ اپنے ساتھ بچے لے آتیں۔

بڑا ہال کمرہ الہامی کتابوں کیلئے مخصوص تھا اور ساتھ کے دو کمرے مہاجرین اور گاؤں والوں کیلئے مختص کر دیئے گئے تھے۔ ان سب کے جوتے ایک ترتیب میں دہلیز کی دوسری طرف رکھے تھے۔

میت سنگھ نے لالٹین کی روشنی میں شام کی دعا پڑھی ایک آدمی اس کے پیچھے کھڑا دعا کے اختتام پر زور سے چھوٹی متھنی بجاتا۔ یہ مذہبی جماعت گیت گاتی جبکہ میت سنگھ گرنتھ کو زرق برق سلکی غلاف میں لپیٹ کر رات کیلئے رکھ دیتا۔ پجاری اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے ہاتھ باندھ لیتے۔ میت سنگھ سب سے آگے اپنی مخصوص جگہ پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ دوبارہ دس گرو کے نام لیتا۔ وہ شہید سکھوں اور ان کے مزاروں کیلئے رحمت کی دعا کرتے۔ سارا مجمع زور سے آمین کہتا ہوا التجا کے آخر میں واہے گرو۔ کہتا۔ وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے اور اپنے ماتھے زمین پر رگڑتے اور اس طرح یہ تقریب اختتام پذیر ہو جاتی تھی۔ میت سنگھ آ کر دوسروں کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ یہ ایک شاندار اجتماع ہوتا تھا جس میں صرف بچے کھیل رہے ہوتے تھے وہ کمروں میں ایک دوسرے کو ڈھونڈتے ہنستے اور بحث کرتے۔ نوجوان ان بچوں کو ڈانٹتے۔ ایک ایک کر کے بچے اپنی ماؤں کی آغوش میں جا کر لیٹ جاتے اور سو جاتے جس کے بعد مرد اور عورتیں بھی کمروں کے مختلف حصوں کے فرش پر لیٹ جاتے۔ دن کے واقعات نیند میں بھی نہیں بھلائے جا سکتے تھے۔ بہت سے سو ہی نہیں پاتے تھے۔ کچھ آدھی نیند سوتے اور اپنے ساتھ والے کا بازو یا ٹانگ چھو جانے کے باعث چونک جاتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ظاہری خراٹے لیتا تو سکون پاتا اور دن بھر کے واقعات سے نجات پاتا۔ سوتے میں وہ انجن کی آواز مویشوں اور لوگوں کے چیخنے کی آواز سنتے وہ نیند میں ہی رونا شروع ہو جاتے۔ اور ان کی داڑھی ان کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی۔ صبح جب موٹر کا ہارن ایک دفعہ پھر سنائی دیا گیا تو وہ جو جاگ گئے اونگھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ جو خواب دیکھ رہے تھے وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ اپنے خواب میں یہ سن رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے خواب میں ''ہاں ہاں'' کہہ رہے تھے اس آواز کے جواب میں جو ان سے پوچھ رہی تھی۔

کیا تم سب مر گئے ہو؟ آدھی رات کو ایک جیپ آئی جو کہ صبح آئے ہوئے فوجی افسروں جیسی ہی تھی۔ اس کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ یہ گاؤں کی طرف آ رہی ہے۔ وہ گھر گھر جا کر پوچھنے لگے۔

کیا یہاں کوئی ہے؟ جواب میں صرف کتے بھونکتے۔ تب وہ مندر آئے اور گاڑی کے انجن کو بند کر دیا۔ دو آدمی صحن میں آئے اور دوبارہ چلائے۔

''کیا یہاں کوئی ہے یا سب مر گئے ہیں۔'' سب اٹھ بیٹھے۔ کچھ بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ میت سنگھ اپنے لالٹین کی بتی کو لے کر واپس مڑا۔ وہ اور نمبردار باہر آنے والوں سے ملنے کیلئے آئے۔

آدمیوں نے اس ہلچل کو دیکھا جو کہ انہوں نے پیدا کی تھی۔ انہوں نے نمبردار اور میت سنگھ کو نظر انداز کر دیا اور بڑے کمرے کی چوکھٹ کی طرف چل دیئے۔ ایک نے پریشان حال مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا۔

کیا تم سب مر گئے ہو؟

کیا تم میں سے کوئی زندہ ہے؟ دوسرے نے مزید کہا۔

نمبردار نے غصے سے جواب دیا۔ اس گاؤں میں کوئی نہیں مرا۔ تم کیا چاہتے ہو؟

اس سے پہلے کہ وہ آدمی جواب دیتے ان کے دو ساتھی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سب سکھ تھے۔ انہوں نے خاکی یونیفارم پہن رکھی تھی اور اپنے کاندھوں پر رائفلیں لٹکائی ہوئی تھیں۔

یہ گاؤں کسی حد تک مرا ہوا لگتا ہے۔ ایک اجنبی نے اپنے ساتھیوں کو اونچی آواز میں مخاطب کر کے دوبارہ دہرایا۔

گرو اس گاؤں پر رحم کرے۔ یہاں کوئی نہیں مرا۔ میت سنگھ نے بڑی شان سے جواب دیا۔

اچھا اگر گاؤں والے مرے نہیں تب تو یہ ہونا چاہیے کہ اسے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ یہ خواجہ سرا سے بنے ہوئے ہیں۔

ایک ملاقاتی نے سخت غصے میں ہاتھ لہرا کر کہا۔

اجنبیوں نے اپنے جوتے اتارے اور بڑے کمرے میں آ گئے۔ نمبردار اور میت سنگھ ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ وہاں پر موجود سب لوگ اٹھ بیٹھے اور اپنی پگڑی کسنے لگے۔ عورتوں نے اپنے بچے اپنی گودوں میں لے لیے اور انہیں دوبارہ سلانے کیلئے ہلانے لگیں۔

سکھ فوجیوں کے گروپ میں ایک جوان کا سردار لگ رہا تھا اس نے اشارے سے سب کو بیٹھنے کا کہا۔ سب بیٹھ گئے لیڈر چہرہ سے انیس سال تک کی شباب کی عمر کا چھوٹی سی داڑھی والا لڑکا تھا جو کہ اس کی تھوڑی سے ہیر کریم کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ وہ قد میں چھوٹا جسم کا دبلا پتلا اور ان سب چیزوں کے ساتھ تھوڑا نامرد سا لگ رہا تھا۔ ایک چمکتا ہوا لال ربن اس کی چمکتی ہوئی نیلی پگڑی کے بل کے زاویے میں سے جھلک رہا تھا۔ اس کی خاکی فوجی قمیض اس کے کاندھوں پر سے ڈھیلی ڈھیلی لٹک رہی تھی۔ اس نے کالے چمڑے کی فوجی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی تنگ سی چھاتی کے گرد چمڑے کی پٹی بندوق کی گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور چوڑی سی بیلٹ اس کی تنگ کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک طرف ریوالور لگایا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے دوسری طرف ایک خنجر تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ اس کی ماں نے اسے امریکی چرواہے کی طرح کپڑے پہنا کر تیار کیا تھا۔

اس نے اپنے ریوالور پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کی انگلیاں ریوالور کی سلور گولیوں پر پھرنے لگیں۔ اس نے بڑے اعتماد سے اپنے اردگرد دیکھا۔

”کیا یہ سکھوں کا گاؤں ہے؟ اس نے بدتمیزی سے پوچھا۔ گاؤں والوں پر صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ ایک پڑھا لکھا شہری باشندہ ہے۔ اس قسم کے لوگ جب کسانوں سے بات کرتے ہیں تو اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتے ہیں۔ وہ عمر یا اسٹیٹس کا کوئی خیال نہیں کرتے۔

ہاں سر۔ نمبردار نے جواب دیا۔

یہ ہمیشہ سے سکھوں کا گاؤں ہے۔ ہمارے پاس مسلمان مزارع تھے لیکن اب وہ جا چکے ہیں۔

تم کس قسم کے سکھ ہو؟ لڑکے نے آنکھوں میں خطرناک چمک کے ساتھ پوچھا۔

اس نے اپنے سوال کو تفصیلاً پوچھا۔

مرد یا نامرد۔

کوئی نہ جان سکا کہ کیا کہے۔ کوئی بھی یہ احتجاج نہ کر سکا کہ گردوارے میں اس قسم کی زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے جبکہ عورتیں اور بچے بھی یہاں موجود ہیں۔

کیا تم جانتے ہو کہ مرے ہوئے ہندو اور سکھوں سے بھری ہوئی کتنی ٹرینیں آ چکی ہیں؟ کیا تم راولپنڈی اور ملتان' گوجرانوالہ اور شیخوپورہ میں ہونے والے قتل عام کے بارے میں جانتے ہو؟ تم نے اس کا بدلہ لیا؟ تم صرف کھا رہے ہو اور سو رہے ہو۔ اور تم سب اپنے آپ کو سکھ کہتے ہو۔ بہادر سکھ! جنگی کلاس! اس نے مزید اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر طنز کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے سننے والوں کا چمکتی ہوئی آنکھوں سے جائزہ لیا کہ آیا کہ کوئی اس کی تردید تو نہیں کر رہا۔ لوگوں نے کسی حد تک اپنے آپ سے شرمندہ ہو کر نیچے دیکھنا شروع کر دیا۔

ہم کیا کر سکتے ہیں۔ سردار جی؟ نمبردار نے سوال کیا۔ اگر ہماری حکومت پاکستان کے خلاف جنگ کرتی ہے تو ہم بھی لڑیں گے۔ منوں مجرا میں بیٹھ کر ہم کیا کر سکتے ہیں؟

حکومت' لڑکے نے حقارت سے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ تم امید کرتے ہو کہ حکومت کچھ کرے گی؟ حکومت بزدل زمینداروں سے بنی ہے۔ کیا وہ اپنی حکومت سے درخواست کر کے پہلے اجازت لیتے ہیں جب وہ تمہاری بہنوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں؟ کیا وہ اجازت لینے کیلئے درخواست کرتے ہیں جب وہ ٹرینیں روکتے ہیں اور ہر ایک کو چاہے وہ بوڑھا ہو۔ جوان ہو یا عورت اور بچے ہوں سب کو مار دیتے ہیں؟ تم چاہتے ہو کہ حکومت کچھ کرے! یہ تو بہت اچھی بات ہے! شاباش' بہادرو!

اس نے اپنے ریوالور بکس کو دوسری طرف کرتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

لیکن سردار صاحب! نمبردار نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

یہ بہتر ہے' لڑکے نے جواب دیا۔

اب ہم بات کر سکتے ہیں۔ سنو اور بڑے دھیان سے سنو۔

وہ کچھ دیر کیلئے رکا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اور دوبارہ شروع ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ہر جملے پر زور دیتے ہوئے اپنی انگلیوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے۔

ایک ہندو اور سکھ جنہیں وہ مار رہے ہیں۔اس کے بدلے دو مسلمان مارو ایک عورت جسے وہ جبراً اغوا کر رہے ہیں یا اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں کے بدلے دو عورتیں ان کی جبراً اٹھاؤ۔ ایک گھر جسے انہوں نے لوٹا ہے کے بدلے دو لوٹو۔ مرے ہوئے لوگوں سے بھری ایک ٹرین جو کہ وہ یہاں بھیج رہے ہیں کے بدلے ان کی طرف دو بھیجو۔ ہر ایک مسلح حفاظتی دستہ جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کے بدلے میں دو مسلح حفاظتی دستوں پر حملہ کرو۔ اس طرح ہی اس طرف ہونے والے قتل کو روک سکیں گے۔ یہ ان کو سبق سکھا دے گا کہ ہم بھی قتل و غارت اور لوٹ مار کا یہ کھیل کھیل سکتے ہیں۔

نوجوان سکھ افسر اپنی باتوں کے اثر کا اندازہ کرنے کیلئے رک گیا۔ لوگ پورے انہماک و توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ صرف میت سنگھ اوپر کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا گلا صاف کیا لیکن رک گیا۔ اچھا۔ بھائیو۔ تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ لڑکے نے انہیں چیلنج دیتے ہوئے کہا۔

میں یہ کہنے جا رہا تھا۔ میت سنگھ نے رک رک کر کہا۔ میں یہ کہنے جا رہا تھا' اس نے دہرایا۔

یہاں مسلمانوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ جس کے بدلے میں ہم انہیں ماریں۔ وہاں کے مسلمان جو مرضی کرتے رہیں۔ صرف ان لوگوں کو سزا ملنی چاہیے جو جرائم کرتے ہیں۔

سکھ نوجوان غصے سے میت سنگھ کو گھورنے لگا۔

ہندو اور سکھوں نے کیا کیا تھا کہ وہ ظالم قصائی بن گئے؟ کیا وہ معصوم نہیں تھے؟ کیا عورتیں بھی جرائم میں ملوث تھیں کہ جس کی وجہ سے وہ دل کو لبھائی گئی تھیں؟ کیا بچوں نے بھی قتل کیے تھے کہ جس کی وجہ سے انہیں ان کے ماں باپ کے سامنے تیز نوک کے

آلے سے قتل کر دیا گیا؟

میت سنگھ زیر ہو گیا تھا۔ لڑکا اسے مزید شرمندہ کرنا چاہتا تھا۔

کیوں۔ بھائی؟ اب بولو اور کہو کہ تم کیا چاہتے ہو؟ میں ایک بوڑھا بھائی ہوں۔ میں کسی کے خلاف لڑائی میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا یا قاتلوں کو نہیں قتل کر سکتا۔ معصوم اور غیر مسلح لوگوں کو مارنے میں کیا بہادری ہے؟ عورتوں کے بارے میں تم جانتے ہو گے کہ ہمارے آخری گرو گوبند سنگھ نے جو کہا ہے اس کو حلف کا حصہ بنا دیا گیا ہے کہ کوئی بھی سکھ مسلمان عورت کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اور صرف خدا جانتا ہے کہ انہوں نے کتنی تکالیف برداشت کیں۔ انہوں نے ان کے چاروں بیٹوں کو قتل کر دیا تھا۔ سکھ ازم کی یہ باتیں کسی اور کو سکھاؤ ورنہ لڑکے نے متکبرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ تم جیسے ہی لوگ ہیں جو اس ملک کیلئے مصیبت ہیں۔ تم نے عورتوں کے بارے میں گرو کا حوالہ دیا ہے لیکن تم ہمیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟

میت سنگھ نے آہستہ سے جواب دیا۔

لیکن کسی نے تم سے یہ نہیں کہا کہ ان سے دوستی نہ رکھو۔ چاہے گرو نے خود اپنی فوج میں مسلمان رکھے ہوں۔

اور ان میں سے ایک نے ان کے چھرا گھونپ دیا تھا جبکہ وہ سو رہے تھے۔ میت سنگھ کو بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

ان میں سے ایک نے ان کے چھرا گھونپ دیا جب وہ سو رہے تھے۔ لڑکے نے دہرایا۔

ہاں۔ لیکن ایک آدھ برے بھی ہوتے ہیں اور......؟

مجھے ایک بھی اچھا دکھاؤ۔

میت سنگھ اس حاضر دماغی کے ساتھ مزید بحث نہ کر سکا۔ وہ نیچے اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی نے جیسے اس کی شکست کو دعوت دی۔

اسے چھوڑ دو۔ یہ ایک بوڑھا بھائی ہے۔ اسے اپنی پوجا کرنے کیلئے چھڑی پکڑا

دو۔ بہت ساروں نے مل کر کہا۔

تقریر کرنے والے کا جوش کم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی شان دکھانے کیلئے اپنا لہجہ شاندار بناتے ہوئے مجمع کو دوبارہ مخاطب کیا۔

یاد رکھو۔

اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

یاد رکھو اور کبھی مت بھولو کہ ایک مسلمان تلوار کے سوا کسی دلیل کو نہیں جانتا۔

مجمع نے ہوں ہوں کی آواز نکال کر منظوری دے دی۔

کیا یہاں کوئی گرو کو چاہنے والا ہے؟ کوئی ایک جو کہ اپنی زندگی سکھ قوم کیلئے قربان کرنا چاہتا ہو۔ کوئی ایک ہمت کے ساتھ؟ اس نے ایک ایک جملہ چیلنج دینے کے طور پر زور دے کر کہا۔ دیہاتی بہت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ زوردار تقریر نے انہیں غصہ دلا دیا تھا اور وہ اپنی مردانگی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت میت سنگھ کی موجودگی نے انہیں بے آرام کر دیا تھا اور انہیں احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ بے وفائی کر رہے تھے۔

بالغرض ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نمبردار نے درد سے پوچھا۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ لڑکے نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اگر آپ میں کچھ کرنے کی ہمت ہو۔ کچھ وقفے بعد اس نے بات جاری رکھی۔

کل مسلمانوں سے بھری ہوئی ایک ٹرین پاکستان جانے کیلئے پل کو عبور کرے گی۔ اگر تم مرد ہو تو یہ ٹرین اسی طرح جانی چاہیے جس طرح دوسری طرف بہت سے لوگ مارے گئے ہیں جیسا کہ تم نے وصول کیا ہے۔ ایک سرد احساس تمام سننے والوں پر چھا گیا۔ لوگ گھبرا کر کھانسنے لگے۔

ٹرین پر منوں مجرا کے مسلمان سوار ہوں گے۔ میت سنگھ نے اوپر دیکھے بغیر کہا۔

بھائی۔ لگتا ہے تم سب کچھ جانتے ہو۔ کیا نہیں جانتے تم؟ جوان پشم کی طرح چلایا۔

کیا تم نے انہیں ٹکٹ دیئے تھے یا کیا تمہارا بیٹا ریلوے بابو ہے؟ میں نہیں جانتا کہ ٹرین پر سوار مسلمان کون ہیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میرے لئے تو یہ جاننا ہی کافی

ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ وہ زندہ اس دریا کو پار نہیں کریں گے۔ اگر آپ لوگ میرے ساتھ راضی ہیں تو ہم بات کر سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگ ڈرتے ہیں تو بتا دیں اور ہم آپ کو ست سری کال' کہہ کر جائیں اور اصل مردوں کیلئے کہیں اور دیکھیں۔

ایک دفعہ پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ ہو گیا۔ لڑکے نے اپنے پستول پر ہاتھ مارا اور اپنے اردگرد کے موزوں چہروں کی طرف صبر سے دیکھا۔

پل پر فوج کی نگرانی ہے۔ یہ ملی تھا۔ وہ اندھیرے میں دور کھڑا تھا۔ اس میں اکیلے دوبارہ منوں مجرا آنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن اب وہ بے خوفی سے گردوارے میں داخل ہوا۔ اس کے گینگ کے کئی آدمی اس کے ساتھ دروازے پر نظر آئے۔

تمہیں فوج اور پولیس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کوئی بھی مداخلت نہیں کرے گا۔ جو کرے گا ہم اس کو دیکھ لیں گے۔

لڑکے نے پیچھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ کیا یہاں پر کوئی رضا کار ہے؟

میری زندگی آپ کے سپرد ہے۔ ملی نے ایک ہیرو کی طرح کہا۔ جگا سے مار کھانے کی اس کی کہانی گاؤں میں بھلائی جا چکی تھی۔ اس کی شہرت دوبارہ فدیہ دے کر بحال ہو گئی تھی۔

بہادرو۔ سکھ نوجوان افسر نے کہا۔ کم از کم ایک آدمی تو ہے۔ گرو جب سکھ بنا رہے تھے انہوں نے زندگیوں کا کہا تھا وہ جو سکھ سپر مین تھے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ کی ضرورت ہے۔ کون ہے جو خوشی سے اپنی زندگی قربان کرنے کا خواہش مند ہے؟

ملی کے ساتھیوں میں سے چار نے دہلیز سے قدم آگے بڑھایا۔ وہ اور دوسروں کے پیچھے چل دیئے جن میں سے زیادہ پناہ گزین تھے۔ کئی دیہاتی جو چند دن پہلے اپنے مسلمان دوستوں کے جانے پر روئے تھے رضا کار بننے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ہر دفعہ جب کوئی ایک اپنا ہاتھ بلند کرتا تو نوجوان سکھ انہیں جوش دلانے کیلئے کہتا۔

بہادرو۔

اسے اپنے پاس آنے کا کہتا اور الگ بیٹھا لیتا۔ تھوڑی دیر میں پچاس کے قریب

دیہاتی احمقانہ جسارت کیلئے تیار ہو گئے۔

یہ کافی ہیں۔لڑکے نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

اگر ہمیں مزید رضا کاروں کی ضرورت پڑے گی تو میں آپ لوگوں کو دوبارہ کہہ دوں گا۔اب آؤ اور اپنے اس کام کی کامیابی کیلئے دعا کریں۔جس میں ہماری جان بھی جا سکتی ہے۔

گوردوارے میں موجود سب لوگ کھڑے ہو گئے۔عورتوں نے اپنے بچے فرش پر بٹھائے اور مردوں کے ساتھ دعا میں شامل ہو گئیں۔مجمع کے سامنے چھوٹا سا چھپڑ تھا جہاں گرنتھ لپٹا لپٹا تھا اور دعا میں اپنے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔لڑکا میت سنگھ کی طرف مڑ کر گیا۔کیا آپ دعا کرا دیں گے۔بھائی جی؟ اس نے طعنہ دیتے ہوئے پوچھا۔

کیا یہ تمہارا مشن ہے۔سردار صاحب۔میت سنگھ نے عاجزی سے جواب دیا۔

تم دعا کراؤ۔لڑکے نے اپنا گلا صاف کیا۔آنکھیں بند کیں اور زبانی گرو کے نام لینے شروع کر دیئے۔آخر میں اس نے اس جان جوکھوں کے کام کی کامیابی کیلئے گرو سے دعا کی۔مجمع اپنے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا اور زور سے اپنے ماتھے زمین پر رگڑے۔زور زور سے باضابطہ اعلان کیا کہ۔

نانک کے نام سے۔اس امید کے ساتھ کہ یقین قائم رہے گا۔خدا کے لطف و کرم سے۔ہم دنیا کے مصائب' کامیابی کی امید کے ساتھ برداشت کریں گے۔مجمع دوبارہ کھڑا ہو گیا اور گیت گنگنانے لگا۔

سکھ حکومت کریں گے۔ان کے دشمن منتشر ہو جائیں گے۔صرف وہ اور پناہ گزین محفوظ رہیں گے۔

رسمی سی یہ محفل ست سری کال۔کی آوازوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔اس لیڈر لڑکے کے سوا سب لوگ بیٹھ گئے۔دعا نے اسے شرمساری کا احساس دلایا تھا۔اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور مجمع سے معافی مانگی۔

بہنوں اور بھائیو۔اتنی رات گئے آپ لوگوں کو تنگ کرنے کیلئے معافی کا طلبگار ہوں۔آپ سے بھی۔بھائی جی۔اور آپ سے نمبردار صاحب۔مہربانی فرما کر اس تکلیف

کیلئے ہمیں معاف کر دیں اور ان غصے والے الفاظ کیلئے بھی جو میں نے استعمال کئے ہوں لیکن یہ سب گرو کی خدمت میں ہے۔رضا کار دوسرے کمرے میں آ جائیں تاکہ اگر کوئی آرام کرنا چاہے تو کر لے۔ست سری کال۔

ست سری کال۔کچھ سننے والوں نے جواب دیا۔

میت سنگھ کے کمرے کو جو صحن کی ایک طرف تھا عورتوں اور بچوں نے صاف کر دیا تھا۔ملاقاتی رضا کاروں کے ساتھ اس میں آ گئے لیمپ بھی منگوا لئے گئے۔لیڈر نے ایک نقشہ نکال کر بستر پر پھیلا لیا۔اس نے لالٹین اٹھا لی۔رضا کاروں کا مجمع نقشہ پڑھنے کیلئے اس کے اردگرد جمع ہو گیا۔کیا تم سب دریا اور پل کی پوزیشن دیکھ سکتے ہو۔جہاں پر تم ہو۔اس نے پوچھا۔

ہاں ہاں۔رضا کاروں نے بے صبری سے جواب دیا۔

کیا تم میں سے کسی کے پاس بندوق ہے؟

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔نہیں کسی کے پاس بندوق نہیں۔

اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔لیڈر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ہمارے پاس چھ یا سات رائفلیں اور غالباً دو اسٹین گنیں ہیں تم اپنی تلواریں اور برچھیاں لے آنا۔وہ بندوق سے زیادہ کام کریں گی۔

وہ بولتے بولتے کچھ دیر کیلئے رکا۔

پلان یہ ہے کہ کل سورج غروب ہونے کے بعد جب اندھیرا چھا جائے گا ہم ایک رسہ پل کے پہلے ستونوں سے باندھ دیں گے۔یہ رسہ انجن سے ایک فٹ اونچا ہو گا۔جب ٹرین اس کے نیچے سے گزرے گی تو یہ ٹرین کی چھت پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو نیچے گرا دے گا۔ٹرین کی چھت پر چار پانچ سو آدمی ہوں گے۔وہ سب نیچے گر جائیں گے۔

اچھا' سننے والوں کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔انہوں نے اثبات میں ایک دوسرے کے سامنے گردن ہلائی اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔نمبردار اور میت سنگھ باتیں سننے کیلئے دروازے پر کھڑے تھے۔لیڈر لڑکا غصے سے ان کی طرف مڑا۔

بھائی جی۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ جاتے کیوں نہیں اور اپنی پوجا کریں؟

نمبردار اور میت سنگھ دونوں بے وقوفوں کی طرح واپس آ گئے۔ نمبردار جانتا تھا کہ اگر وہ بھی وہاں کھڑا رہا تو اسے بھی یہی کہہ دیا جائے گا۔

اور آپ نمبردار صاحب۔ لڑکے نے کہا۔

آپ پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کرا آئیں۔

سب ہنسنے لگے۔ لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر کمرے میں موجود سب لوگوں کو خاموش کرایا۔ اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

ٹرین آدھی رات کو چندن نگر سے چلے گی۔ اس میں کوئی لائٹ نہیں یہاں تک کہ اس کے انجن میں بھی کوئی لائٹ نہیں ہے۔ اپنے آدمیوں کو ریلوے پٹڑی کے ساتھ ساتھ ہر سو گز کے فاصلے پر بیٹری ٹارچ کے ساتھ کھڑا کر دیں گے۔ ہر ایک دوسرے کو اشارہ دے گا جب اس کے پاس سے ٹرین گزرے گی۔ کسی بھی صورت حال میں تم اسے سننے کے قابل ہو گے۔ تم میں سے کچھ لوگ پل کے دائیں طرف اپنی تلواروں اور نیزوں کے ساتھ ان لوگوں کو مارنے کیلئے موجود ہوں گے جو کہ ٹرین کی چھت سے گریں گے۔ وہ انہیں مار دیں گے اور دریا میں پھینک دیں گے۔ ہمارے دوسرے آدمی پٹڑی کے ساتھ ساتھ اپنی بندوقوں کے ساتھ چند گز کے فاصلے پر کھڑے ہوں گے اور کھڑکیوں کا نشانہ لیں گے۔ جوابی فائر کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا کیونکہ ٹرین پر صرف ایک درجن پاکستانی سپاہی موجود ہوں گے۔ اندھیرے میں وہ اس بات کا اندازہ نہیں کر پائیں گے کہ کس کا نشانہ لیں۔ ان کے پاس اپنی بندوقوں کو لوڈ کرنے کا بھی وقت نہ ہو گا۔

اگر وہ ٹرین کو روکیں گے تو ہم ان کو قابو کر لیں گے۔ چونکہ وہ اس کیلئے تیار نہ ہوں گے اس لئے اور بھی زیادہ مریں گے۔

یہ بغیر کسی خطرے کے بدلہ لینے کا ایک مکمل پلان تھا۔ ہر ایک خوش تھا۔ آدھی رات تو پہلے ہی گزر چکی ہے۔ لڑکے نے نقشے کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

آپ لوگوں کیلئے بہتر ہے کہ کچھ دیر سو جائیں۔ کل صبح ہم پل پر جائیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ کس کو کہاں کھڑا ہونا ہے۔ سکھ خدا کا چناؤ ہیں۔ جیت ہمارے خدا کیلئے

ہے۔'' جیت ہمارے خدا کی ہے۔'' دوسروں نے جواب دیا۔

اجلاس ختم ہو گیا۔ ملاقاتیوں کو گردوارے میں ہی کمرہ مل گیا تھا۔ ملی اور اس کا گینگ وہیں رک گیا۔ جب سازش تیار ہو رہی تھی۔ بہت سے دیہاتی جو اس بات سے متفق نہ تھے اپنے گھروں کو چلے گئے کہ کم از کم وہ مندر میں ہونے والے اس جرم اور گناہ میں شریک تو نہ ہوں گے۔

نمبردار نے اپنے ساتھ دو آدمی لئے اور چندن نگر کے پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

ٹھیک ہے۔ انسپکٹر صاحب۔ انہیں مرنے دیں۔ مجسٹریٹ حکم چند نے غصے میں کہا۔

سب کو مرنے کیلئے چھوڑ دو۔ صرف دوسرے اسٹیشنوں سے مدد مانگو اور تم جو پیغامات بھیجو اسے ریکارڈ میں رکھو۔ تاکہ بعد میں ہم یہ ثابت کرنے کے قابل ہوں کہ ہم نے انہیں روکنے کیلئے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی تھی۔

اس وقت حکم چند ایک تھکا ہوا مایوس انسان لگ رہا تھا۔

اس کے بالوں کی سفید جڑیں لمبی ہو چکی تھیں۔ اس نے جلدی میں شیو کی تھی اور اس کے چہرے پر کئی جگہ کٹ لگ گیا تھا۔ اس کی تھوڑی لمبی تھی۔ اور اس کی مڑی ہوئی جلد کا گوشت بیل کے لٹکتے ہوئے ماس کی طرح اس کی تھوڑی کے گرد موجود تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے کونوں کو میل نکالنے کیلئے ملنا شروع کر دیا۔ جو آنکھوں میں نہیں تھی۔

میں کیا کروں؟ وہ چلایا۔

ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ تو اسے پاگل ہونے دو۔ کوئی مسئلہ نہیں اگر ہزار پھر مر جائیں گے تو کیا ہو گا؟ ہم بلڈوزر منگوائیں گے اور لاشوں کو ایسے ہی دبا دیں گے جس طرح ہم نے پہلے دبائی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں بلڈوزر کی ضرورت نہ پڑے اگر اس بار یہ سب کچھ دریا پر ہو جائے تو لاشوں کو پانی میں پھینک دو۔ اگر چار سو ملین میں سے کچھ سو نکال دیئے جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک وبائی مرض دس بار اتنے لوگوں کی جان لے لیتا ہے اور کوئی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

سب انسپکٹر جانتا تھا کہ یہ اصلی حکم چند نہیں بول رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ سے صرف غم والم نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر بے صبری سے انتظار کر رہا تھا تب ہی اس نے اس کے دل کا حال جاننے کیلئے کہا۔

ہاں سر، میں ان تمام ہونے والے واقعات کو ریکارڈ میں رکھ رہا ہوں اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ پچھلی رات ہم نے چندن نگر کے خطرناک علاقوں کو خالی کرایا تھا۔ میں فوج پر یہاں تک کہ اپنے کانسٹیبل پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جو بہتر کر سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ میں نے سکھ پناہ گزینوں کو یہ کہہ کر روکے رکھا کہ پاکستانی فوجی قصبے میں موجود ہیں۔ یوں میں بروقت مسلمانوں کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ جب سکھ حملہ آوروں کو اس چال کا علم ہوا تو انہوں نے ہر مسلمان کو لوٹا اور ان کے گھروں کو آگ لگا دی۔

مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کچھ مجھے پکڑنے کیلئے پولیس اسٹیشن آئیں گے لیکن بہتر صلاح مشورے سے اس پر قابو پا لیا گیا۔ تو آپ نے دیکھا۔ سر۔ میں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کرنے کی وجہ سے گالیاں کھائیں۔ سکھوں کو لوٹ مار اور ڈاکے سے روکنے کی وجہ سے جس کی وہ امید کئے ہوئے تھے مجھے صرف گالیاں ملیں۔ اب مجھے امید ہے کہ حکومت بھی مجھے کچھ گالیاں دے گی یا کچھ اور۔ یہ سب کچھ میرے بڑے انگوٹھے میں ہے۔

سب انسپکٹر نے اپنا انگوٹھا باہر نکالا اور مسکرا دیا۔

آج صبح ہی سے حکم چند کا دماغ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ سب انسپکٹر کی رپورٹ کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

ہاں انسپکٹر صاحب۔ آپ اور میں ان سب سے بدنامی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ سب نے خوشی خوشی بندوقیں چلائیں۔ لوگوں نے اپنی رائفل کی بھری ہوئی میگزینیں ٹرینوں اور حفاظتی دستوں اور مہاجرین کے قافلوں پر خالی کیں۔ جیسے کہ وہ سرخ پانی ہولی کے تہوار میں پھینکتے تھے۔ یہ تو خون کی ہولی ہے۔ جہاں پر یہ گولیاں چلتی ہیں وہاں کیا منظر ہوتا ہے۔ بندوق کی گولیاں نہ تو رکیں گی نہ ہی یہ سمجھے گی کہ یہ حکم چند ہے۔ مجھے اسے نہیں چھونا چاہیے۔ گولیوں پر کوئی نام نہیں لکھا ہوتا۔ یہاں

تک کہ اگر وہ نام جان بھی جائے تو ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ گولی کون چلا رہا ہے۔ نہیں۔ انسپکٹر صاحب۔ ایک ہوشمند انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ دلاسے کے بجائے یہ ظاہر کرے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح پاگل ہے اور پہلا موقع ملتے ہی دیواروں کی پیمائش کرے اور باہر نکل جائے۔

سب انسپکٹر ان خطبوں کا عادی تھا اور جانتا تھا کہ مجسٹریٹ کس طرح سے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن حکم چند کا اشاروں میں اپنی نالائقی کو ظاہر کر دینا حیران کن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی بھی کوئی بات سیدھی صاف نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اسے بیوقوف سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں موقع شناسی کا فن ایک سیدھی صاف چیز تھی، جس کے آداب اس میں شامل لوگوں کو آنے چاہئیں۔ موقع شناس کبھی بھی کسی کو مشکل میں نہیں ڈالتی۔

اس صبح وہ اپنے دماغ کو سکون دینا چاہ رہا تھا کل آپ کو چندن نگر ہونا چاہیے تھا۔ سب انسپکٹر نے دوبارہ سے گفتگو کا آغاز کیا تاکہ ان حقیقی مسائل کے بارے میں بتا سکے جس کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔

اگر مجھے پانچ منٹ کی بھی دیری ہو جاتی تو وہاں ایک بھی مسلمان زندہ نہ بچتا جس طرح کہ اب ایک بھی نہ مرا۔ میں ان سب کو باہر نکالنے کے قابل تھا۔

سب انسپکٹر نے ایک بھی نہیں اور سارے پر بہت زور دیا وہ حکم چند کے ردعمل کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

تم نے یہ کام کیا۔ حکم چند نے اپنی آنکھوں کے کونوں کو رگڑنا بند کر دیا۔

تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ چندن نگر میں اب کوئی مسلمان خاندان نہیں بچا ہے؟

نہیں سر۔ ایک بھی نہیں۔

میرا خیال ہے۔ حکم چند نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو وہ دوبارہ واپس آ جائیں گے۔

ہوسکتا ہے۔ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ان کیلئے یہاں واپس آنے کیلئے کچھ نہیں بچا ہے۔ ان کے گھر جل چکے ہیں یا ان پر قبضہ کیا جا چکا ہے۔ اور اگر کوئی واپس آیا

یا آئی تو اس کیلئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

آخر وہ ہمیشہ کیلئے تو نہیں گئے۔ تم دیکھتے ہو کہ حالات کس طرح بدلتے ہیں۔ ایک ہفتے میں وہ واپس چندن نگر آ جائیں گے اور سکھ اور مسلمان دوبارہ سے ایک ہی مٹکے سے پانی پئیں گے۔ حکم چند اپنی ہی آواز میں جھوٹی امیدیں باندھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بات میں کوئی وزن نہیں۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ سر لیکن ان سب کے ہونے میں یقیناً ایک ہفتہ لگے گا۔ چندن نگر کے مہاجرین آج رات کو ٹرین کے ذریعے پاکستان لے جائے جا رہے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے زندہ اس پل کے پار جاسکیں گے ان وجوہات کی بناء پر کوئی بھی جلدی واپس آنا پسند نہیں کرے گا۔

تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ چندن نگر کے پناہ گزین رات کی ٹرین سے جا رہے ہیں۔ حکم چند نے پوچھا۔

مجھے یہ کیمپ کے کمانڈر سے معلوم ہوا ہے۔ وہاں کیمپ پر بھی حملے کا خطرہ ہے اسی لئے انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ پہلی ٹرین جو بھی انہیں مہیا آ سکے اس پر مہاجرین کو نکال دیں۔ اگر وہ نہیں جاتے تو شاید کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا اگر وہ چلے جاتے ہیں تو کم از کم کچھ تو زندہ جاسکیں گے۔ بشرطیکہ ٹرین کچھ رفتار سے چلے۔ ٹرین کو پٹڑی سے اتارنے کا ان کا کوئی پلان نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ لاشوں سے بھری پاکستان جائے۔

حکم چند نے بے چین ہو کر اپنی کرسی کے بازو مضبوطی سے پکڑ لئے۔ تم نے سر کیمپ کے کمانڈر کو اس کے بارے میں خبردار کیوں نہیں کیا؟ وہ نہ جانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

سب انسپکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ٹرین پر ہونے والے متوقع حملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیونکہ اگر وہ نہیں گئے تو پورا کیمپ تباہ ہو سکتا ہے۔ تقریباً بیس سے تیس ہزار مسلح دیہاتیوں کا اژدھام مسلمانوں کے خون کا پیاسا پھر رہا ہے۔ میرے پاس صرف پچاس پولیس والے ہیں اور ان میں سے ایک بھی سکھوں پر گولی نہیں چلا سکے گا۔ لیکن اگر آپ اس اژدھام کو روکنے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں تو میں کیمپ کمانڈر کو ٹرین پر حملہ کرنے کے فوج کے پلان کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔

سب انسپکٹر نے نیچے بیلٹ پر ضرب لگائی۔

نہیں نہیں۔ مجسٹریٹ ہکلایا۔ اس مسلح اژدھام کے سامنے میرا اثر و رسوخ کیا کر سکتا ہے؟ نہیں ہمیں ضرور سوچنا چاہیے۔

حکم چند دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ اس نے آہستہ سے اپنے ماتھے کو پیٹا اور اپنے بالوں کو زور سے جھٹکا دیا کہ جیسے کہ وہ اپنی داڑھی میں سے خیالات کھینچ کر نکال سکے گا۔

ان دو آدمیوں کا کیا ہوا جنہیں تم نے زمیندار کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا؟ اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

سب انسپکٹر نے متعلقہ کاروائی کو نہیں دیکھا تھا۔

وہ اب بھی جیل میں بند ہیں۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ انہیں اس وقت تک بند رکھوں جب تک یہ ساری مشکلات ختم نہ ہو جائیں یہ جو قتل ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے میں انہیں کچھ مہینوں تک ابھی رکھوں گا۔

کیا وہاں کوئی مسلمان عورت ہے یا کوئی بھٹکا ہوا مسلمان کہ جس نے منوں مجرا چھوڑنے سے انکار کیا ہو؟

نہیں سر۔ کوئی نہیں بچا۔ مرد، عورتیں، بچے سب جا چکے ہیں۔ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

وہ ابھی تک حکم چند کو ٹرین سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جولاہے کی وہ لڑکی جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا۔ کیا نام تھا اس کا؟

اوٗ ہاں۔ نوراں، وہ کہاں ہے؟

وہ جا چکی ہے۔ اس کا باپ منوں مجراں کے مسلمانوں کا لیڈر تھا نمبردار نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی صرف ایک ہی اکلوتی بیٹی ہے۔ نوراں۔ جس پر جگا ڈاکو سے تعلقات کے الزام ہیں۔

اور اس کا دوسرا ساتھی تم نے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ ایک سیاسی قسم کا ورکر تھا

ہاں سر۔ پیپلز پارٹی یا اسی طرح کی کچھ اور، مجھے لگتا ہے کہ وہ مسلم لیگی ہے اور

بہروپ بدل کر کسی اور کا جھوٹا لیبل لگائے ہوئے ہے۔ میں نے چیک کیا تھا۔

کیا تم حکم نامے کیلئے کوئی سرکاری سادہ کاغذ لائے ہو؟

حکم چند نے بے صبری سے پوچھا۔

ہاں سر۔ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

اس نے پیلے رنگ کے چھپے ہوئے بہت سے کاغذ نکالے اور مجسٹریٹ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

حکم چند نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سب انسپکٹر کی جیب سے اس کا سیاہی والا قلم نکال لیا۔

قیدیوں کے کیا نام ہیں؟ اس نے کاغذ کو میز پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ جگا بدمعاش اور ....

جگا بدمعاش۔ حکم چند نے خالی کاغذ پر لکھتے ہوئے کہا اور اس کو دھرانے لگا۔

جگا بدمعاش اور..........؟ اس نے دوسرا کاغذ لیتے ہوئے پوچھا۔

اقبال محمد یا محمد اقبال۔ مجھے یقین نہیں کہ ان میں سے کونسا ہے؟ اقبال محمد نہیں۔ انسپکٹر صاحب۔ نہ ہی محمد اقبال' اقبال سنگھ۔

اس نے لہرا کر لکھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر سب انسپکٹر تھوڑا پریشان ہو گیا۔

سر۔ آپ کو ہر ایک پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے چیک ....

کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان ان حالات میں ان علاقوں میں آنے کی جرات کر سکتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی پارٹی اتنی بیوقوف ہو گی کہ وہ ایک مسلمان کو سکھ کسانوں کو تعلیم دینے کیلئے بھیجے گی جو پہلے ہی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ انسپکٹر صاحب؟

تمہارا دماغ کہاں ہے۔ تم کس دنیا میں رہتے ہو؟

انسپکٹر خاموش ہو گیا اسے یہ اچھا نہیں لگا کہ ایک پڑھا لکھا انسان کسی بھی وجہ سے اس کی گردن پر سارا معاملہ ڈال دے گا۔ اس کے علاوہ اس نے اقبال کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا بھی دیکھا تھا جو کہ سب سکھ پہنتے ہیں۔

آپ کی بات بالکل درست ہے لیکن ٹرین پر ہونے والے حملے کی روک تھام کیلئے کیا کیا جائے۔

میری رائے درست ہوتی ہے۔ حکم چند نے ایک فاتح کی طرح کہا اور تم جلدی جان جاؤ گے کیوں؟ تم اس کے متعلق چندن نگر کے راستے میں سوچنا۔ جتنی جلدی ممکن ہو ان دونوں کو رہا کر دو اور دیکھنا کہ وہ فوراً منوں مجرا جانے کیلئے یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ اگر ضروری ہو تو نہیں ایک ٹانگہ کرا دینا۔ وہ شام تک گاؤں پہنچ جائیں گے۔

سب انسپکٹر نے کاغذات اٹھائے اور سلیوٹ کیا۔ اور اپنی سائیکل پر واپس پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

آہستہ آہستہ پریشانی کے بادل اس کے ذہن سے رفع ہو گئے۔ حکم چند کا پلان اسی طرح صاف چمکنے لگا جس طرح بہت زیادہ بارش کے بعد دن روشن ہوتا ہے۔

تم منوں مجرا کو کچھ بدلا بدلا دیکھو گے۔

سب انسپکٹر نے اپنی رائے دی جس طرح عموماً وہ میز کے آگے کھڑے ہو کر دیتا تھا۔ اقبال اور جگا دوسری طرف اس کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ بیٹھتے کیوں نہیں۔ بابو صاحب؟ سب انسپکٹر نے کہا۔ اس بار وہ سیدھا اقبال سے مخاطب ہوا۔ مہربانی فرما کر کرسی لے لیں۔

اوئے۔ کیا نام ہے تیرا۔ تم بابو صاحب کیلئے کرسی کیوں نہیں لاتے؟

وہ کانسٹیبل پر چلایا۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ بولتا رہا۔

مجھے اپنی ڈیوٹی کرنی تھی تم ایک پڑھے لکھے انسان ہونے کے ناطے جانتے ہو کہ میرا رویہ عام لوگوں سے مختلف کیوں ہوتا ہے۔ کانسٹیبل اقبال کیلئے کرسی لے آیا۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ایک چائے کا کپ پلاتا ہوں یا کچھ اور منگواؤں؟

سب انسپکٹر آہستہ آہستہ سے مسکرایا۔

بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ میں بیٹھنے کے بجائے کھڑا رہنا چاہوں گا۔ ان تمام دنوں میں' میں کوٹھری میں بیٹھا ہی رہا ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو جتنی جلدی ممکن ہو

سکے ضابطے کی کاروائی مکمل کریں تا کہ میں جلدی یہاں سے جا سکوں۔

اقبال نے مسکراہٹ کے بغیر ہی جواب دیا۔

تم آزاد ہو جہاں اور جب جانا چاہو جا سکتے ہو۔ میں تمہیں تانگہ منگوا دیتا ہوں جو کہ تمہیں منوں مجرا لے جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ایک مسلح کانسٹیبل بھی بھیج دوں گا۔ چندن نگر یا دوسری غیر محفوظ جگہوں پر پھرنا محفوظ نہ ہو گا۔

سب انسپکٹر نے پیلا کاغذ اٹھایا اور پڑھا۔

جگت سنگھ۔ ولد آلام سنگھ عمر چوبیس سال۔ ذات سکھ۔ سکونت منوں مجراں بدمعاش دس نمبری۔

ہاں سر۔ جگا سب انسپکٹر کو ٹوکتے ہوئے مسکرایا۔ پولیس کے سلوک نے اسے بالکل نہیں بدلا تھا۔

تم بھی آزاد ہو۔ لیکن تمہیں مسٹر [illegible] چند ڈپٹی کمشنر کے سامنے یکم اکتوبر 1947ء کو صبح دس بجے پیش ہونا ہے۔ اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان لگاؤ۔

سب انسپکٹر نے کالی جالی کے ٹین کے ڈبے کو کھول کر اس میں سے پیڈ نکالا۔ اس نے جگت سنگھ کا انگوٹھا اپنے ہاتھ میں پکڑا۔ اس کو پیڈ بکس پر رگڑا اور کاغذ پر دبا دیا۔

کیا مجھے جانے کی اجازت ہے۔ جگا نے پوچھا۔

تم بابو صاحب کے ساتھ تانگے میں جا سکتے ہو ورنہ تم رات ہونے سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکو گے۔ اس نے جگا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ تم منوں مجرا کو پہلا جیسا نہیں پاؤ گے۔

لیکن ان دونوں نے سب انسپکٹر کی اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ سب انسپکٹر نے دوسرا [illegible] کھولا اور پڑھا۔

مسٹر اقبال سنگھ۔ سوشل ورکر۔

اقبال نے طنز بھرے انداز میں کاغذ کی طرف دیکھا۔

اقبال محمد نہیں اور نہ ہی مسلم لیگ کا ممبر؟ لگتا ہے کہ آپ حقیقت کو اپنی طرف سے گھڑ رہے ہیں اور کاغذ جیسے آپ چاہیں بنا لیں۔

سب انسپکٹر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ہر کوئی غلطی کرتا ہے۔ غلطی انسان کرتا ہے اور معاف دیوتا کرتے ہیں۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔

یہ تو آپ کی بڑی فیاضی ہے۔ اقبال نے جواب دیا۔ مجھے ہمیشہ سے اس بات پر یقین تھا کہ انڈین پولیس معصوم ہوتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میرا مذاق اڑا سکتے ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اگر آپ کسی کو سبق دینے جا رہے ہوں جس میں آپ دلچسپی رکھتے ہیں اس وقت آپ سکھوں کے اژدھام میں گھر جائیں تو وہ آپ کے کوئی دلائل نہیں سنیں گے۔ بلکہ وہ یہ دیکھنے کیلئے آپ کے کپڑے بھی اتار دیں گے کہ آپ کے ختنے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ان دنوں ایسے لوگوں کیلئے جن کے لمبے بال اور داڑھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے یہی ٹ چیک رکھا ہوا ہے۔ جس کے ختنے ہوتے ہیں وہ اسے مار دیتے ہیں۔ آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔

اقبال کسی قسم کی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ موضوع ایسا نہیں تھا کہ جس پر وہ کسی کے ساتھ بحث کرے۔ اسے دکھ تھا کہ سب انسپکٹر نے آزادی کو کن معنوں میں لیا ہے۔

تم منوں مجرا میں بہت سی تبدیلیاں پاؤ گے۔ سب انسپکٹر نے تیسری بار خبردار کیا۔ لیکن جگا اور اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔ اقبال نے جھک کر میز پر سے کتابیں اٹھائیں اور بغیر شکریہ ادا کئے اور خدا حافظ کہے چل دیا۔ فرش کی وجہ سے جگا کو احساس ہوا کہ وہ ننگے پیر ہے۔ تمام مسلمان منوں مجرا سے جا چکے ہیں۔ سب انسپکٹر نے تذبذب کے انداز میں کہا۔ جگا نے اپنے پاؤں رگڑنے بند کر دیئے۔ وہ کہاں گئے ہیں؟

کل وہ مہاجر کیمپ لے جائے گئے تھے آج رات وہ ٹرین کے ذریعے پاکستان جائیں گے۔

کیا گاؤں میں کوئی مسئلہ تھا؟ انسپکٹر صاحب۔ وہ کیوں گئے ہیں؟

اگر وہ نہ جاتے تو ضرور وہاں کوئی مسئلہ ہوتا۔ وہاں پر مسلمانوں کو مارنے کیلئے بہت سے باہر کے باشندے بندوقیں لے کر آ گئے ہیں ملی اور اس کے آدمی بھی ان میں شامل ہو گئے ہیں۔ اگر مسلمان منوں مجرا نہ چھوڑتے تو ملی اب تک انہیں ختم کر چکا ہوتا۔

اس نے ان کی سب چیزوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ جیسے گائے، بھینس، بیل، گھوڑیاں، مرغیاں اور عام استعمال کے برتن۔ ملی نے بہت اچھا کیا ہے۔ انسپکٹر کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

جگا کو ایک دم غصہ چڑھ گیا۔ یہ ملی خنزیر کا بچہ اپنی ماں کے ساتھ سوتا ہے۔ اپنی بہن بیٹی کا دلال ہے۔ اگر اس نے منوں مجرا میں اپنا پاؤں بھی رکھا تو میں بانس اس کے پیچھے گھسا دوں گا۔

سب انسپکٹر نے طنزیہ مسکراتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچے۔

تم بڑا بول رہے ہو۔ سردارا۔ کیونکہ تم نے بغیر بتائے اچانک اس کے بال پکڑ لئے تھے اور اسے مارا تھا۔ تم سوچتے ہو کہ تم ایک شیر ہو لیکن یاد رکھو ملی بھی کوئی عورت نہیں کہ جو اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے اور کلائی میں چوڑیاں پہنے بیٹھی ہو۔ وہ منوں مجرا میں ہے اور جو چاہ رہا ہے وہ کر رہا ہے۔ وہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ جب تم واپس جاؤ گے تو تم اسے دیکھ لو گے۔

وہ ایک گیدڑ کی طرح بھاگے گا جب وہ میرا نام سنے گا۔ جگا نے چیخ کر کہا۔

اس کے گینگ کے آدمی اس کے ساتھ ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور دوسرے بھی۔ سب کے سب بندوقوں اور پستولوں سے مسلح ہیں۔ تمہارے لئے بہتر ہو گا کہ تم اس سے معقول طریقے سے بات کرو۔ اگر تمہیں اپنی جان بچانی ہے۔

جگا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ٹھیک ہے۔ انسپکٹر صاحب۔ ہم دوبارہ ملیں گے۔ تب مجھے ملی کے بارے میں بتانا۔

اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔

اگر میں نے اس کے کولہوں کے نیچے نہ تھوکا تو میرا نام بھی جگت سنگھ نہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ کے پچھلے حصے سے اپنے منہ کو رگڑا۔

اگر میں نے ملی کے منہ پر نہ تھوکا تو میرا نام جگت سنگھ نہیں اس بار جگت سنگھ نے اپنے ہی ہاتھ پر تھوکا۔ اور اپنی ران پر رگڑ دیا اس کا پارہ بخار کی طرح چڑھ رہا تھا۔

اگر آپ کی پولیس درمیان میں نہ آئے۔ میں اس باپ کے بیٹے سے ملنا پسند

کروں گا جس میں جگت سنگھ کے سامنے پلک جھپکنے کی بھی جرات ہو۔

اس نے اپنی چھاتی باہر نکالتے ہوئے مزید کہا۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سردار جگت سنگھ۔ ہم مان گئے کہ تم ایک بڑے بہادر آدمی ہو۔ سب انسپکٹر مسکرا دیا۔

بہتر ہے کہ تم اندھیرا پھیلنے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ۔ بابو صاحب کو اپنے ساتھ لے لو۔ آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بابو صاحب ضلع کا بہادر آدمی آپ کی دیکھ بھال کیلئے آپ کے ساتھ ہے۔ اس سے پہلے کہ جگت سنگھ انسپکٹر صاحب کی بات کا جواب دے پاتا۔ ایک کانسٹیبل نے آ کر اعلان کیا کہ ٹانگہ آ گیا ہے۔

ست سری کال۔ انسپکٹر صاحب۔ جب ملی چیختا ہوا میرے خلاف رپورٹ لکھوانے آئے تب آپ سمجھ لینا کہ جگت سنگھ صرف جھوٹے دعوے کرنے والا انسان نہیں ہے۔ سب انسپکٹر ہنس دیا۔

ست سری کال۔ جگت سنگھا۔ ست سری کال۔ اقبال سنگھ جی۔

اقبال بغیر مڑے آگے کو چل دیا۔

ٹانگہ دوپہر میں چندن نگر سے نکلا تھا۔ یہ ایک طویل غیر ہنگامہ خیز سفر تھا۔ اس دفعہ جگت سنگھ آگے کی سیٹ پر کوچوان اور پولیس والے کے ساتھ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ اقبال کیلئے چھوڑ دی تھی۔ کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ بھولا کوچوان پولیس کی وجہ سے اس وقت بھی خدمت کیلئے حاضر تھا۔ جب کہ گھر سے قدم نکالنا بھی محفوظ نہ تھا۔ وہ اپنے بھورے گھوڑے کو مسلسل چابک مارتا اور قسمیں دیتا جا رہا تھا جبکہ دوسرے اپنی سوچوں میں گم تھے۔ دیہات کے بیرونی حصے میں مکمل سناٹا تھا۔ وہاں کا وسیع علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا جس نے اسے ہموار بنا دیا تھا۔ کھیتوں میں مرد یا عورتیں نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ مویشی بھی گھاس نہیں چر رہے تھے۔ دونوں گاؤں جہاں سے وہ گزرے، کتوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ ایک دو دفعہ انہوں نے کنوئیں کے پیچھے سے تیزی سے چلتے قدموں کی آواز سنی تھی یا کونوں سے کسی کو گھورتے اور ایک آدھ کو بندوق یا خنجر اٹھائے دیکھا تھا۔ اقبال سمجھ گیا کہ یہ جگا کے آدمی تھے اور جو کہ دیکھنے میں سکھ لگ رہے تھے۔ انہوں نے

واقعی اسے رکنے اور سوال و جواب سے بچایا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے چلا جائے جہاں اسے اپنی زندگی بچانے کیلئے اپنے آپ کو سکھ ہونا ثابت کرنا تھا۔ وہ منوں مجرا سے اپنی چیزیں اٹھائے گا اور پہلی ٹرین پکڑ لے گا۔ لیکن شاید وہاں کوئی ٹرین نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو ان میں سے کسی ایک پر سوار ہونا مصیبت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اسے اپنی قسمت پر افسوس ہو رہا تھا کہ اپنے نام اقبال کی وجہ سے اس نے اتنی مصیبتیں اٹھائیں اور دنیا میں کہیں ایسا نہ تھا کہ ایک انسان کی زندگی کا انحصار اس کے مذہب پر تھا۔ ایسا ہندوستان میں ہو رہا تھا۔ اگر یہ المناک نہ ہوتا تو ہنسنے کے قابل ہوتا۔ اس نے سوچا۔ وہ کئی دن منوں مجرا میں رہے گا اور اپنی حفاظت کیلئے میت سنگھ کے ساتھ رہے گا۔ میت سنگھ اپنے بکھرے بالوں کے ساتھ اس کے خیالوں میں آ گیا۔ سوچ اچانک تبدیل ہو گئی اگر وہ صرف دہلی جا سکا اور متمدن ممالک کی طرف! وہ اپنی گرفتاری کے بارے میں بتائے گا۔ اس کی پارٹی کا اخبار اس کی تصویر کے ساتھ یہ خبر پہلا صفحے پر سرخی کے ساتھ چھاپے گا۔

"انگریز امریکی سرمایہ دار سازش و بدنظمی کی وجہ سے اقبال سرحد پر گرفتار۔"

یہ سب چیزیں اس کو ہیرو بنا سکیں گی۔

جگا کو سب سے زیادہ تشویش نوراں کے بارے میں تھی وہ ٹانگے میں بیٹھے یا گاؤں کے اپنے ساتھیوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ملی کو بھول چکا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف یہ خیالات باقی رہ گئے تھے کہ نوراں گاؤں منوں مجرا میں ہو گی۔ کوئی بھی نہیں چاہ سکتا کہ امام بخش جائے۔ یہاں تک کے اگر وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ چلا بھی گیا ہو تو نوراں ضرور کھیتوں میں کہیں چھپی ہو گی۔ یا اس کی ماں کے پاس آئی ہو گی۔ اسے امید تھی کہ اس کی ماں نے اسے واپس نہیں لوٹایا ہو گا۔ لیکن اگر اس کی ماں نے واپس کیا ہو گا تو وہ باہر چلا جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ اپنے باقی کے دن اپنے کئے کے پچھتاوے میں گزارے گی۔

جگا پریشانی اور غصے کے عالم میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔

جب ٹانگہ سکھوں کے گردوارے کے قریب کی پگڈنڈی پر سے گزرنے کیلئے

آہستہ ہوا تو اس نے چلتی گاڑی میں سے چھلانگ لگا دی اور خدا حافظ کہے بغیر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اقبال ٹانگے سے نیچے اترا اور اپنی ٹانگیں پھیلائیں کوچوان اور کانسٹیبل آپس میں آہستہ آہستہ صلاح مشورے کرنے لگے۔

کیا میں آپ کی اور خدمت کر سکتا ہوں۔ بابو صاحب؟ سپاہی نے پوچھا۔

نہیں نہیں۔ تمہارا شکریہ۔ میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری بڑی مہربانی ہے۔

اقبال اکیلے گردوارے نہیں جانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے ساتھ کسی کو نہیں لایا تھا کہ اسے کہہ سکے کہ اس کے ساتھ آؤ۔

بابو جی۔ ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔ میرا گھوڑا سارے دن سے بغیر کچھ کھائے پیئے باہر پھر رہا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ وقت کیا ہو گیا ہے۔

ہاں۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ تمہارا شکریہ۔ ست سری کال۔ ست سری کال۔

گوردوارے کا صحن لیمپ کے سوراخوں میں سے نکلنے والی روشنی کی وجہ سے داغدار ہو رہا تھا۔ اور آتش دانوں میں آگ جل رہی تھی جس پر خواتین شام کا کھانا پکا رہی تھیں۔ بڑے ہال کے ساتھ والے کمرے میں لوگ میت سنگھ کے گرد دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جو کہ انہیں شام کی دعا زبانی سنا رہا تھا۔ جس کمرے میں اقبال نے اپنی چیزیں چھوڑی تھیں وہ بند تھا۔

اقبال نے اپنے جوتے اتارے اور رومال سے اپنا سر ڈھانپا اور اس مجلس میں شامل ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کیلئے جگہ چھوڑ دی۔ اقبال کو احساس ہوا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں اور سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مہاجرین تھے۔

جب دعا ختم ہو گئی تو میت سنگھ نے مقدس کتاب کو مخمل کے غلاف میں لپیٹ دیا اور اسے چارپائی پر رکھ دیا جس پر اسے کھول کر رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اقبال سے سوال کرتا اس نے اقبال سے بات شروع کی۔

ست سری کال۔ اقبال سنگھ جی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم واپس آ گئے ہو۔ تم ضرور بھوکے ہو گے۔

اقبال کو محسوس ہوا کہ جیسے میت سنگھ جان بوجھ کر اس کا نام لے رہا ہے۔ اسے

محسوس ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ کچھ مرد اس کی طرف مڑے اور ست سری کال کہا۔

ست سری کال۔ اقبال نے جواب دیا اور میت سنگھ سے ملنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سردار اقبال سنگھ۔ میت سنگھ نے دوسروں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

ایک سوشل ورکر ہیں۔ آپ کئی سال سے انگلینڈ میں تھے۔

سب کی متاثر کن آنکھیں اقبال پر مرتکز ہو گئیں اقبال کو تھوڑی پریشانی کا احساس ہوا۔

آپ سکھ ہیں۔ اقبال سنگھ جی؟ ایک آدمی نے پوچھا۔

ہاں۔

دو ہفتے پہلے اس نے پرزور طریقے سے جواب دیا تھا کہ نہیں۔ یا یہ کہ میرا کوئی مذہب نہیں۔ یا مذہب غیر متعلق ہوتا ہے۔ لیکن اب صورتحال مختلف تھی اور ہر صورت میں یہ سچ تھا کہ وہ ایک سکھ پیدا ہوا تھا۔

کیا انگلستان میں آپ اپنے بال کاٹتے تھے؟ اسی آدمی نے پوچھا

نہیں جناب اقبال نے گھبرا کر جواب دیا۔

میں اپنے بال لمبے نہیں بڑھا سکتا۔ میں بغیر داڑھی اور بغیر لمبے بالوں والا سکھ ہوں۔

تمہارے والدین ضرور اپنے حقیقی ہوں گے۔ میت سنگھ نے اس کی مدد کیلئے آتے ہوئے کہا۔

اس جملے نے اس پر کئے جانے والے شک و شبہ کو کم کر دیا تھا لیکن اقبال کے ضمیر کو بے چین کر دیا تھا۔

میت سنگھ نے ٹٹولتے ہوئے اپنی جانگیہ کی ڈوری کو پکڑا اور اس کے آخر میں لٹکی ہوئی چابیوں کے گچھے کو باہر نکالا۔ اس نے الہامی کتابوں کے قریب اسٹول پر رکھی ہوئی لالٹین کو اٹھایا اور صحن سے کمرے تک کا راستہ دیکھنے لگا۔ میں نے تمہاری چیزیں کمرے میں تالے میں رکھی ہیں۔ تم انہیں لے سکتے ہو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانا لاتا ہوں۔

نہیں بھائی جی۔ پریشان نہ ہوں۔ میرے پاس کافی ہے مجھے بتائیں کہ میرے

جانے کے بعد گاؤں میں کیا کچھ ہوا؟ یہ سب لوگ کون ہیں؟

بھائی نے دروازے کا تالا کھولا اور طاق میں ایک چراغ رکھ دیا۔ اقبال نے اپنا تھیلا کھولا اور خالی بوتلیں وغیرہ چارپائی پر رکھ دیں۔ اس میں مکھن اور پنیر۔ ایلومینیم کے چھری کانٹے، چمچے اور چاقو اور پلاسٹک کے پرچ پیالیاں تھے۔ بھائی جی! کیا ہوا تھا؟ اقبال نے دوبارہ پوچھا۔

کیا ہوا تھا؟ مجھ سے پوچھو کہ کیا نہیں ہوا۔ مرے ہوئے لوگوں سے بھری ایک ٹرین منوں مجرا آئی تھی۔ ہم نے ایک بھری ہوئی کو تو جلا دیا اور دوسری کو دفن کر دیا۔ دریا لاشوں سے بھر چکا تھا۔ مسلمان علاقہ خالی کر گئے ہیں اور ان کی جگہ پاکستان سے مہاجر آ گئے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟

اقبال نے رومال سے پلاسٹک کی پلیٹیں اور گلاس صاف کئے۔ اس نے اپنا سلور تھرموس نکالا اور اسے ہلایا تو وہ بھرا ہوا تھا۔

کیا تم نے اس سلور بوتل میں کچھ رکھا ہے؟

اوہ یہ دوائی ہے۔ اقبال ہچکچایا۔

یہ مجھے بھوک لگانے کیلئے دی گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مزید کہا۔ اور تم نظام ہاضمے کیلئے گولیاں لیتے ہو۔

اقبال ہنس دیا۔ ہاں اور مزید بھوگ بڑھانے کیلئے۔

مجھے بتائیں کہ کیا گاؤں میں قتل ہوا تھا؟

نہیں ۔ بھائی نے عام انداز میں کہا۔ وہ اقبال کو ہوائی گدے میں ہوا بھرتے ہوئے بڑے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہاں ہوا ہوگا۔ کیا اس گدے پر اچھی نیند آتی ہے۔ کیا انگلینڈ میں سب لوگ اسی پر سوتے ہیں۔

تمہارا مطلب کیا ہے کہ ادھر قتل ہوئے ہوں گے؟ اقبال نے گدے کے آخری حصے کو بھرتے ہوئے کہا۔

سارے مسلمان جا چکے ہیں کیا وہ نہیں گئے؟

ہاں۔ لیکن وہ آج رات پل کے قریب ٹرین پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ

چندن نگر اور منوں مجرا کے مسلمانوں کو پاکستان لے جا رہی ہے۔ تمہارا تکیہ بھی ہوا سے بھر گیا ہے۔

ہاں۔ وہ حملہ کرنے والے ہیں؟ گاؤں والے تو نہیں۔

میں ان سب کو نہیں جانتا۔ کچھ لوگ وردی پہنے فوجی گاڑی میں آئے تھے۔ ان کے پاس پستولیں اور بندوقیں تھیں مہاجر بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ ملی بدمعاش اس کا گروہ اور کچھ دیہاتی بھی ان سے مل چکے ہیں۔ اگر اس گدے پر کوئی وزنی بھاری انسان سوئے تو کیا یہ پھٹے گا نہیں۔ میت سنگھ نے گدے کو ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

میں سمجھا۔ اقبال نے میت سنگھ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

میں اب چال سمجھ گیا ہوں۔ اسی وجہ سے پولیس نے ملی کو رہا کیا ہے۔ اور اب میرا خیال ہے کہ جگا بھی ان میں شامل ہو جائے گا۔ سب انتظامات ہیں۔

وہ گدے پر لیٹ گیا اور تکیے کو اپنے بازوؤں میں دبا لیا۔

بھائی جی۔ آپ انہیں روکتے کیوں نہیں؟ وہ سب آپ کی بات مانتے ہیں۔

میت سنگھ نے گدے کو تھپ تھپایا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک بوڑھے بھائی کی کون سنتا ہے؟ یہ برا وقت ہے۔ اقبال سنگھ جی۔ بہت برا وقت۔ یہاں پر کوئی دین یا مذہب نہیں یہ دنیا نئے شادی شدہ جوڑے کیلئے کچھ نہیں کرتی۔

اس نے چاہت سے گدے پر چپت لگاتے ہوئے مزید کہا۔

اقبال بے چین ہو گیا۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا آپ اسے روک نہیں سکتے۔ آپ انہیں کیوں نہیں کہتے کہ جو لوگ ٹرین پر ہیں وہ ان کے چچا، چچی، بھائیوں اور بہنوں کی طرح ہیں؟

میت سنگھ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اس نے اپنے کاندھے پر پڑے ہوئے رومال سے آنسو پونچھے۔

میری باتوں سے ان پر کیا فرق پڑے گا؟ وہ جانتے ہیں جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ وہ غلط کریں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو وہ گردوارے شکریہ ادا کرنے آئیں گے۔ وہ اپنے گناہ معاف کرنے کیلئے پیشکش بھی کریں گے۔ اقبال سنگھ جی اپنے بارے

میں کچھ بتائیں۔ کیا آپ ٹھیک رہے ہیں؟

کیا پولیس اسٹیشن میں آپ کے ساتھ اچھا سلوک ہوا ہے؟

ہاں۔ ہاں۔ میں بالکل ٹھیک تھا۔ اقبال نے بے چینی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم کچھ کیوں نہیں کرتے؟ تم کر سکتے ہو۔

میں جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا ہوں۔ میرا فرض ہے لوگوں کو بتانا کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔ اگر وہ گناہ کرنے پر بضد ہیں تو میں خدا سے کہوں گا کہ انہیں معاف کر دے۔ میں صرف دعا کر سکتا ہوں۔ پولیس اور مجسٹریٹ اور آپ کیلئے۔

میرے لئے میرے لئے کیوں؟! اقبال نے چونک کر معصومیت سے پوچھا۔

میں اس کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔ میں ان لوگوں کو نہیں جانتا پھر وہ ایک اجنبی کی بات کیوں مانیں گے؟

جب آپ آئے تھے تو آپ کسی چیز کے بارے میں ان کو کچھ کہنے جا رہے تھے۔ آپ اب انہیں کیوں نہیں کچھ کہتے؟

بھائی جی۔ جب لوگ بندوقیں اور خنجر اٹھا لیں تو آپ ان سے صرف بندوقوں اور خنجروں سے ہی بات کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں۔

یہی تو اصل بات ہے جو میں کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ آپ اپنے یورپین خیالات کے ساتھ کچھ حل نکال سکتے تھے۔ اچھا مجھے اجازت دیں کہ آپ کیلئے تھوڑی گرم گرم پالک لے آؤں۔ میں نے خود پکائی ہے۔ میت سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

نہ نہ۔ بھائی جی۔ جو کچھ مجھے چاہیے میرے ڈبے میں ہے اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑی تو میں آپ سے مانگ لوں گا۔ کھانا کھانے سے پہلے مجھے تھوڑا کام کرنا ہے۔

میت سنگھ نے بستر کے پاس رکھے اسٹول پر سے لالٹین اٹھائی اور واپس ہال کی طرف چل دیا۔

اقبال نے اپنی پلیٹیں، چھری، کانٹے اور ڈبے تھیلے میں ڈالے۔ اسے اپنا بدن

تھوڑا گرم محسوس ہوا۔ اس قسم کا گرم کہ جب کوئی محبت میں گرفتار ہوتا ہے یہی وقت تھا کسی چیز کے بارے میں اعلان کرنے کا' اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

کیا اسے اژدھام کا سامنا کرنے باہر جانا چاہیے تاکہ انہیں صاف صاف کہہ دے کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔ وہ اپنی آنکھیں مسلح ہجوم پر ڈال کر بغیر پیچھے ہٹے بغیر مڑے ایک ہیرو کی طرح جو کہ اسکرین پر کیمرے کی طرف چلتے ہوئے بڑے سے بڑا ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ لوگوں کو اس کام سے روک رہا ہو تو کسی جانب سے گولی آئے اور اسے گرا دے۔ اقبال کے پورے وجود پر سنسنی چھا گئی۔

یہاں تو کوئی بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو کہ قربانی دینے کیلئے اتنا بڑا قدم اٹھائے گا۔ وہ اس کو مار دیں گے جس طرح وہ دوسروں کو مار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ غیر جانب دار نہیں ہوگا۔ وہ تو صرف اس کے کپڑے اتاریں گے اور دیکھیں گے کہ اگر ختنے ہوئے ہیں تو پھر وہ مسلمان ہے۔ یہ تو صرف زندگی ضائع کرنیوالی بات تھی اور حاصل کیا ہوگا؟ کچھ نچلے طبقے اور کند ذہن کے لوگ قتل عام کرنے جا رہے تھے۔ سالانہ چار ملین کی بڑھتی ہوئی تعداد میں ہلکی سی رکاوٹ ۔ ابتری کے اس دور میں اپنے نفس کی حفاظت سب سے بڑا فرض ہے۔

اقبال نے زور لگا کر بوتل کا اوپری حصہ کھولا اور پلاسٹک کے گلاس میں شراب ڈالی۔ وہ بڑی صفائی سے اسے پی گیا۔ جب گولی چل جائے اور آپ کے سر میں اڑ جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بندوق کی گولی تو غیر جانبدار ہوتی ہے۔ یہ اچھے اور برے اہم اور غیر اہم سب کو بغیر کسی امتیاز کے لگ جاتی ہے۔ اگر لوگ اسے سینما سکرین پر دیکھیں تو اس قربانی کا مقصد تب ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ جب اس میں سے لوگوں کو ایک اخلاقی سبق حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر سب کچھ فلم کی طرح نہ ہوتا۔ تو غالباً صرف اتنا ہونا تھا کہ اگلی صبح آپ کی لاش بھی دوسرے ہزاروں کے درمیان پائی جاتی۔ دیکھنے میں ان ہی کی طرح۔ بکھرے بال۔ بڑھی ہوئی تھوڑی۔ یہاں تک کہ ختنے بھی ہوئے ہوں کون جان سکے گا کہ آپ مسلمان نہیں تھے؟

حادثے میں مرے یا قتل عام کا شکار ہوئے۔ کس کو پتا ہو گا کہ آپ ایک سکھ

تھے انجام سے باخبر۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں چلتے ہوئے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اچھائی ہمیشہ برائی پر فتح پاتی ہے ۔اقبال نے ایک اور شراب پی لی۔ اس کا ذہن تیز ہوتا معلوم ہو رہا تھا قربانی کیا ہے۔ اس نے سوچا۔ کیا فرض ہے؟ کسی بھی مقصد کی خاطر صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بنیادی طور پر اچھی ہو۔ اسے تو اچھا ہونے کی حیثیت سے پہچانا جانا چاہیے۔ کسی ایک کیلئے یہ جاننا کافی نہیں ہوتا کہ یہ ٹھیک ہے۔ اطمینان تو پہلے سے موجود ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس طرح نہیں ہے کہ اسکول میں اپنے کچھ دوستوں کو بچانے کی خاطر سزا خود بھگتی جائے۔ اس صورت میں آپ کو بہت اچھا محسوس ہو گا اور آپ زندگی بھر قربانی کا مزہ لوٹیں گے۔ لیکن یہ سب معاشرہ کیلئے اچھا نہ ہو گا۔ معاشرہ اس سے قطعی بے خبر ہو گا۔ آپ کیلئے بھی نہیں۔ آپ مر بھی سکیں گے ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو کہ پریشان اور دکھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سبق حاصل کرنے کیلئے تیار تھے۔ یہ سب چیزوں کا عقدہ تھا۔ نیکی صرف تب کرنی چاہیے جب وصول کرنے والا اس کیلئے تیار ہو ورنہ عمل بیکار ہے۔

اس نے گلاس دوبارہ بھرا۔ ہر چیز واضح ہوتی جا رہی تھی۔

ہندوستان پر ریاکار لوگوں کی ایک بڑی تعداد قابض ہے۔ مذہب ہی کو لے لیں۔ ہندو۔ اس کا مطلب مخصوص معاشرتی فرقہ اور گائے کی حفاظت ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک ختنے کرانا ہے۔

سکھوں کیلئے مذہب لمبے بال رکھنا اور مسلمانوں سے نفرت کرنا ہے عیسائیوں کے نزدیک ہندو ازم کی پیروی پارسیوں کیلئے آگ کی پوجا اور گدھوں کو خوراک کھلانا۔ اخلاقیات جو کہ ہر مذہب کی بنیاد ہونی چاہیے۔ بڑی خاموشی سے ختم ہو چکی ہے۔

فلسفہ کو ہی لے لیں عمل کے بغیر یہ صرف بہروپ ہو گا۔

اور یوگا۔ خاص یوگا۔ ڈالر حاصل کرنے کا بہترین طریقہ اپنے سر کے بل کھڑے ہو جایئے۔ بیٹھ کر ٹانگوں کو کانٹے کی صورت میں جوڑیئے۔ اور اپنی ناک سے اپنی ناف میں گدگدی کریں۔ اپنی حواس پر مکمل قابو رکھتے ہوئے۔ خواتین کو اس وقت تک بنائے رکھیں جب تک کہ وہ خود چیخ کر نہ کہیں۔ کافی ہے۔ اور پھر آپ کہہ سکتے ہیں۔ اگلا پلیز بغیر اپنی آنکھیں کھولیں۔

آدمی میں ایک بیل بندر اور بھنورے میں سے اٹھ ملین چار سو ہزار قسم کی جوش دلانے والی چیزیں ہیں۔ ثبوت؟

ہم ثبوت کی خاطر گزرے ہوئے وقت میں پیدل نہیں جا سکتے۔ وہ مغرب ہے۔ ہم مشرق کے پراسرار ہیں۔ کوئی ثبوت نہیں صرف یقین ہے۔ کوئی وجہ نہیں صرف ایمان ہے۔ سوچو! فلسفے' ضابطے اخلاق میں قانون کا کیا نشان ہونا چاہیے۔ کیا اسے چھوڑ دینا چاہیے؟

ہم تصوراتی پروں کے ذریعے بہت اوپر جا سکتے ہیں۔ ہم اختراعی زندگی میں ستاروں پر کمند ڈال دیتے ہیں۔

آرٹ اور میوزک کو ہی لے لیں۔ آخر کیوں۔ اپنے ہم عصر زمانے میں انڈین پینٹنگ' موسیقی' فن تعمیر اور سنگتراشی اتنی بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اب تک اے بی سی پر کان دھرے بیٹھے ہیں۔ میں ایک ہی بات پر کان دھرے رہنا اس صورت میں ٹھیک ہوگا کہ اگر یہ نمونہ نہ بنے۔ اور اگر ایسا ہے تب تو ہم آرٹ کی Cul-de-sac کی صورت میں ہوں گے۔ ہم جھوٹ موٹ کی بے کشش سی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ باطنی ہے۔ یا ہم سب اس طرح لگ جاتے ہیں جس طرح کہ ہندوستانی فلموں کا ماڈرن میوزک لگتا ہے۔

ایک اور شراب کا گلاس۔ شراب پانی کی طرح کی لگ رہی تھی۔ اس کا کوئی مزہ نہیں تھا۔ اقبال نے بوتل کو ہلا کر دیکھا۔ اس نے ہلکی سی آواز سنی۔ یہ خالی نہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ یہ خالی نہیں ہوئی۔ گردوارے کے صحن میں آتش دان کی آگ جل کر راکھ بن چکی تھی۔ چلتی ہوئی تیز ہوا کے جھکڑ انگاروں کو دمکا رہے تھے۔ چراغ کی روشنی مدہم پڑ چکی تھی۔ مرد عورتیں اور بچے بڑے کمرے میں فرش پر ٹانگیں پسارے لیٹے ہوئے تھے۔ میت سنگھ جاگ رہا تھا۔ وہ فرش پر جھاڑو دے رہا تھا۔ اور گندگی کے ڈھیر کو تھیلے میں ڈال رہا تھا۔

کسی نے دروازے پر اپنے مکے سے گھونسے مارنے شروع کر دیے۔ میت سنگھ نے جھاڑو دینا بند کر دی اور بڑبڑاتا ہوا صحن میں سے ہوتا ہوا گیا۔

کون ہے؟

اس نے کنڈی کا قفل کھولا۔ جگا اندر داخل ہوا۔ اندھیرے میں وہ اور بھی زیادہ بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سایہ پورے دروازے کے راستے پر پھیل گیا۔ کیوں۔ جگت سنگھ جی۔ اس وقت آپ کو یہاں کیا کام ہے؟ میت سنگھ نے پوچھا۔

بھائی جی۔ اس نے سرگوشی کی۔

میں گرو کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے لئے نظم کا کچھ حصہ پڑھ دیں گے۔

میت سنگھ نے کہا۔ کیا بات ہے جو تم ایسا کرنا چاہتے ہو؟

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جگا نے بے چینی سے کہا۔ اس نے اپنا بھاری ہاتھ میت سنگھ کے کاندھے پر رکھ دیا۔

کیا آپ میرے لئے اس کی چند لائنیں جلدی سے پڑھ دیں گے۔ میت سنگھ بڑبڑاتا ہوا اپنے کام میں مگن رہا۔

تم آئندہ کبھی کسی وقت بھی گردوارے مت آنا۔ اب جبکہ میں نے الہامی کتابیں رکھ دی ہیں اور سب لوگ بھی سو رہے ہیں تو تم چاہتے ہو کہ میں گرو کی باتیں پڑھوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اچھا میں صبح کی دعا میں سے کچھ حصہ پڑھ دیتا ہوں۔

اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ تم کیا پڑھتے ہو۔ بس اسے پڑھ دو۔ میت سنگھ نے ایک لالٹین کی بتی کو اونچا کیا۔ اس کی کالی دھوئیں سے بھری چمنی روشن ہو گئی۔ وہ چارپائی کے قریب بیٹھ گیا جس پر الہامی کتاب رکھی تھی۔ جگا نے چارپائی کے نیچے سے چھوٹی متھنی (جھاڑن) اٹھائی اور میت سنگھ کے سر پر جھلنی شروع کر دی۔ میت سنگھ ایک چھوٹی سی دعا کی کتاب پر اپنی پیشانی رکھے اٹھا لایا۔ اور جو صفحہ اس سے کھلا اس میں سے ہی نظم پڑھنی شروع کر دی۔

وہ کہ جس نے دن اور رات بنایا ہفتوں کے دن اور موسم۔
وہ جو ٹھنڈی ہوائیں چلاتا اور پانی کو بہاتا ہے۔
آگ اور نچلا علاقہ۔

زمین بنائی۔ قانون کا مندر۔

وہ کہ جس نے مختلف قسم کی چیزیں بنائیں۔

ناموں کے اژدھام کے ساتھ۔

یہ قانون بنایا۔

سورج سے اور سچائی سے ہر فعل کو پرکھنے والا۔

سچائی خدا کیلئے ہے اور انصاف سچائی سے کرنا۔

اس کی منتخب عدالت کیلئے سنگار کرو۔

خدا ان کے عمل کی خود بھی عزت کرتا ہے۔

یہاں بہت سے الگ الگ فعل ہیں جو کیے گئے تھے۔

وہ جن سے یہ عمل ہوئے کبھی بھی آئندہ پختہ نہیں ہو سکتے۔

یہ سب۔ اونانک۔ آئندہ زندگی میں ہوگا۔

میت سنگھ نے دعا کی کتاب بند کر دی اور دوبارہ اپنی پیشانی اس پر رکھی۔ وہ صبح کی دعا کے اختتامی حصے کو منہ ہی منہ میں پڑھنے لگا۔

ہوا پانی۔ مٹی۔

یہ سب۔ ہم نے بنائے ہیں۔

ہوا کہ جس میں گرو کی باتیں ہیں۔ زندگی کو شان دیتی ہے۔

اس کی آواز باریک ہوتے ہوتے بہت دھیمی ہوگئی۔ جگت سنگھ نے چھوٹی متھنی واپس رکھ دی اور الہامی کتاب کے سامنے زمین پر اپنی پیشانی رگڑی۔

کیا یہ ٹھیک ہے۔ اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

گرو کی سب باتیں ٹھیک ہوتی ہیں۔ میت سنگھ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کا کیا مطلب ہے؟

مطلب کا تم کیا کرو گے؟ یہ تو صرف گرو کی باتیں ہیں۔

اگر تم کوئی برا کام کرنے جا رہے ہو تو گرو تمہارے راستے میں کھڑے ہو جائیں گے۔

اگر تم اسے کرنے پر بضد رہو گے تو وہ تمہیں اس وقت تک سزا دیں گے جب تک کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوگا۔ اور وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔

ہاں۔ میں مطلب کا کیا کروں گا؟ اچھا۔ بھائی جی۔ ست سری کال۔

ست سری کال۔ جگا نے دوبارہ اپنی پیشانی زمین پر رگڑی اور اٹھ گیا۔ وہ سوئے ہوئے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا باہر نکلا اور اپنے جوتے اٹھا لئے۔ ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ جگا نے اندر دیکھا۔ اس نے تکیہ پر رکھے ہوئے بکھرے بالوں والے سر کو پہچان لیا۔ اقبال سو رہا تھا۔ اپنی چھاتی پر بوتل دھرے۔

ست سری کال۔ بھائی جی۔

اس نے آرام سے کہا۔ ادھر سے کوئی جواب نہ ملا۔

کیا آپ سو رہے ہیں؟

اسے تنگ مت کر۔ میت سنگھ نے آہستہ سے مداخلت کرتے ہوئے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے سونے کیلئے دوائی لی ہے۔

اچھا۔ بھائی جی۔ آپ میری طرف سے اسے ست سری کال کہہ دینا۔

جگت سنگھ گردوارے سے باہر نکل گیا۔

O

ایک بوڑھے بیوقوف کی طرح کا کوئی بیوقوف نہیں ہوتا۔ یہ جملہ بار بار حکم چند کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ اس نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن یہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔

ایک بوڑھے بیوقوف جتنا کوئی بیوقوف نہیں ہوتا۔ ایک پچاس سالہ شادی شدہ آدمی کا ایک عورت کے پاس جانا اس کیلئے بہت برا تھا۔ اپنی بیٹی جتنی جوان لڑکی سے جذباتی لگاؤ بہت غلط تھا اور جبکہ وہ مسلمان طوائف تھی۔ یہ تو انتہا کی مضحکہ خیز بات تھی۔

چیزوں پر سے اس کی گرفت کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بڑھاپے کی وجہ سے سٹھیا اور احمق بن چکا تھا۔

اس کے منصوبے نے صبح اسے فخر و ناز کا جو احساس دلایا تھا وہ اب ختم ہو چکا

تھا۔ کم از کم ایک پریشانی تو تھی۔ اس نے بدمعاش اور سوشل ورکر کو بغیر کسی جانچ پڑتال
کے رہائی دلوا دی تھی۔ ان میں غالباً اس کے مقابلے میں زیادہ خود اعتمادی نہ تھی۔ کچھ
منافق سوشل ورکرز بہت زیادہ بہادر جانے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک سمجھداری کا کام تھا۔
اس نے شاید دوسروں کو ان کے فرائض بخوبی انجام نہ دینے پر تنقید کرنے کے
سوا کچھ نہ کیا تھا۔

بدمعاش ایک بدنام لیکن بہادر تھا۔ وہ ٹرین میں لوٹ مار کرتا۔ گاڑیاں ہتھیا لیتا
ڈاکے ڈالتا اور قتل کر دیتا تھا۔ یا تو یہ پیسے کی خاطر سب کچھ کرتا تھا یا پھر انتقام لینے کیلئے۔
اس کے پاس ایک ہی موقع تھا کہ وہ ملی سے اپنا حساب بے باق کر لیتا۔ اگر جگا کے پہنچنے
کی خبر سن کر ملی فرار ہو جاتا ہے۔ تو جگا کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
وہ گینگ میں شامل ہو کر دوبارہ سے ستم رسیدہ لوگوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کا کام شروع کر
دے۔ وہ عورتوں کی خاطر اپنے آپ کو خطروں میں ڈالنے والا نہیں۔ اگر نوراں قتل ہو گئی
ہو تو یہ کسی اور لڑکی کو پکڑ لے گا۔

حکم چند اپنی ذمے داری کے حوالے سے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کیا
صرف یہی کافی تھا کہ دوسرے اس کیلئے کام کریں؟ مجسٹریٹ قانون لاگو کرنے نیز قائم
رکھنے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ لیکن وہ احکام کی بجا آوری میں پس پشت طاقت کا استعمال
کرتے ہیں اور اس کی مخالفت بھی نہیں کرتے۔ طاقت کہاں تھی؟ دہلی میں لوگ کیا کر
رہے تھے؟ اسمبلیوں میں بلند و بانگ تقریریں کر رہے ہیں' لاؤڈ سپیکر ان کی بڑائیاں بیان
کر رہے ہیں۔ باہر سے ملاقاتیوں کی حیثیت سے آنے والی خوبصورت عورتیں' گیلری میں
جھوٹی تعریفیں کرتی ہیں۔

وہ ایک عظیم آدمی ہے۔ اور یہ آپ کے مسٹر نہرو۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دنیا کا
عظیم ترین انسان ہے اور کتنا خوبصورت ہے۔ کیا یہ سب کچھ کہنا عجیب بات نہیں تھی؟

حکم چند کا ایک ساتھی پریم سنگھ جو لاہور اپنی بیوی کے زیورات لینے گیا ہوا تھا۔
اس نے فلیٹیز ہوٹل میں میٹنگ رکھی۔ جہاں مغربی صاحب ایک دوسرے کی بیویوں کے
ساتھ تفریحاً محبت کرتے ہیں۔ پریم سنگھ کبھی کبھار شراب پی لیتا اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے

انگریزوں کو بھی دعوت دیتا۔ جنگلے سے باہر درجنوں لوگ ترکی ٹوپی پہنے اور پٹھان پگڑی
باندھے اس کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ مزید شراب پیتا اور اپنے انگریز دوستوں اور
سازندوں کے طائفہ کو بھی اور زیادہ پینے پر مجبور کرتا۔

انگریز بہت زیادہ شراب پیتے اور کہتے کہ پریم سنگھ بہت بھلا مانس تھا۔ چونکہ
شام کے کھانے کیلئے دیر ہو جاتی اس لئے وہ خدا حافظ مسٹر............؟

تمہارا نام یاد نہیں رہتا۔ ہاں۔ یقیناً۔ مسٹر سنگھ بہت بہت شکریہ مسٹر سنگھ۔ دوبارہ
ملیں گے آپ سے۔

وہ شام کے کھانے پر باتیں کرتے۔ یہاں تک کہ سازندوں کی طائفہ انہیں
پہلے سے بھی زیادہ شراب پلا دیتی۔

آپ ہم سے کیا سننا پسند کریں گے؟ لوگوں سے اس طائفے کے گروپ کی لیڈر
پوچھتی۔

پریم سنگھ یورپین موسیقی سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ مشکل سے سوچتا اسے یاد آتا
کہ اس کے سامنے ایک انگریز نے ایک دفعہ کچھ کہا تھا جس کی آواز بنانس جیسی تھی۔

بنانس' پریم سنگھ کہتا۔

آج ہمارے پاس کوئی بنانس نہیں ہے۔ ہاں البتہ سر۔ مینڈوزا۔ ڈی میلو۔ ڈی
سلوا۔ ڈی سارام اور گومز۔ اناڑی پن سے بنانس بجاتے۔ پریم سنگھ لان سے ہوتا ہوا
گیٹ کی طرف چلا گیا۔

سفاری پریم چند کی بیٹی تھی۔ اس کی ملاقات گوجرانوالہ جاتے ہوئے قسمت سے
ہو گئی۔ اس نے چار دن پہلے شادی کی تھی۔ اور اس کے دونوں ہاتھ لاکھ کے روغن والا
چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور اس کی ہتھیلیوں پر لگی مہندی کا گہرا سرخ رنگ ابھی
باقی تھا۔ وہ ابھی تک مانسارام کے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ ان کے رشتے داروں نے انہیں
ایک منٹ کیلئے بھی اکیلا نہ چھوڑا تھا۔ اس نے بمشکل اس کا چہرہ اپنے گھونگھٹ میں سے
دیکھا تھا۔ اب وہ اسے گوجرانوالہ لے جا رہا تھا جہاں وہ چپڑاسی کی حیثیت سے کام کرتا
تھا۔ سیشن کورٹ کے صحن میں اس کا اپنا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اب یہاں کوئی رشتے دار

نہیں ہوگا اور وہ یقیناً اس کی کوشش کرے گا۔ دیکھنے میں وہ تیز نہیں تھا۔

بس میں بیٹھے ہوئے وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ زور زور سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ آدمی لاپرواہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں ہوگا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ نقاب کے پیچھے اس کے چہرے پر کیا ہے؟

لاکھ روغن والی چوڑیوں میں سے ایک بھی نہ اتارنا۔ یہ بدقسمتی لاتی ہے۔ اس کی سہلیوں نے اسے بتایا تھا۔ جب وہ تم سے محبت دکھائے اور زدوکوب کرے تو چوڑیاں اتار دینا۔

درجن سے زیادہ چوڑیوں نے کلائی سے لیکر کونی تک اس کا ہاتھ ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ سخت اور بے لوچ تھیں۔ وہ پیار سے اسے گلے لگاتے ہوئے وحشیوں کی طرح انہیں توڑ دے گا۔ اچانک بس کے رکنے سے اس کے خواب ٹوٹ گئے۔ جو وہ جاگتے میں دیکھ رہی تھی۔ سڑک پر ایک بہت بڑا پتھر رکھ کر رکاوٹ کھڑی کی گئی تھی۔ سینکڑوں سے بھی زیادہ لوگوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جن لوگوں کی داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ ان کے کپڑے اتار کر دیکھا گیا۔ جن کے ختنے ہوئے تھے انہیں معاف کر دیا گیا جس نے ابھی اپنے شوہر مانسارام کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا اب مکمل طور پر برہنہ تھا۔ انہوں نے اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑا اور ایک آدمی نے اس کا عضو تناسل کاٹ کر اسے اس کی بیوی کے سپرد کر دیا۔ انسانوں کا ہجوم اس سے محبت جتا رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک بھی چوڑی نہیں توڑی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی تھی اور ایک کے بعد ایک پھر ایک اس کے اوپر چڑھتا رہا۔

....

سندر سنگھ کا کیس مختلف تھا۔ حکم چند نے اسے فوج سے ریٹائرڈ کیا تھا۔ اس نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ وہ ایک بہادر سکھ تھا۔ جسے برما کی جنگوں میں بہت سے تمغات ملے تھے۔ حکومت نے اسے سندھ میں زمین بھی الاٹ کی تھی۔ وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ ٹرین کے ذریعے آ رہا تھا۔ جس ڈبے میں 40 سیٹیں اور 12 برتھ ہوتی ہیں اس میں پانچ سو سے زیادہ مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں پر کونے میں ایک چھوٹی سی لیٹرین تھی جس کی ٹینکی میں پانی نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ تھا تو صرف ریت اور سورج ....

لیکن پانی بالکل بھی نہیں۔ اسٹیشن پر لوگ جنگلے کے ساتھ ساتھ خنجر لئے کھڑے تھے۔ جس کے باعث ٹرین کو چار دنوں کیلئے اسٹیشن سے پہلے ہی روک لیا گیا۔ کسی کو بھی نیچے اترنے کی اجازت نہ تھی۔ سندر سنگھ کے بچے بھوک اور پیاس سے چلانے لگے۔ سندر سنگھ نے انہیں پینے کیلئے اپنا پیشاب دے دیا۔ اس سے انہیں اور بھی زیادہ پیاس محسوس ہوئی۔ تب اس نے اپنا ریوالور نکالا اور ان سب کو مار دیا۔ سانگڑا سنگھ جس کی عمر چھ سال تھی۔ اپنے لمبے لمبے بھورے بالوں اور سر کے اوپر چھوٹا سا جوڑا بنائے ہوئے تھا۔ ڈکپو کی عمر چار سال تھی۔ اپنی بڑی بڑی مڑی ہوئی خوبصورت پلکوں کے ساتھ حسین بچہ تھا اور امرو کی عمر صرف چار مہینے تھی جو کہ اپنے جبڑے سے اپنی ماں کی خشک چھاتی کو نوچ رہا تھا اور اپنے خشک ہونٹ سکیڑ رہا تھا۔ سندر سنگھ نے اپنی بیوی کو بھی گولی مار دی۔ اس کے بعد وہ اپنے اس کھو بیٹھا۔ اس نے اپنے ہی منہ کی طرف ریوالور تانا لیکن گولی نہ چلائی۔ اپنے آپ کو ختم کرنے کا کیا مقصد تھا۔ ٹرین نے حرکت کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کی لاشیں اٹھائیں۔ اور اپنے ساتھ انڈیا لے آیا۔

حکم چند بہت ذلت محسوس کر رہا تھا۔ رات گزر رہی تھی۔ دریا سے مینڈک کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ برآمدے کے قریب یاسمین کے پھولوں پر جگنو جگمگاتے پھر رہے تھے۔ خدمتگار شراب لے آیا۔ حکم چند نے اسے واپس بھیج دیا۔ خدمتگار نے شام کا کھانا لگا دیا تھا۔ لیکن اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اس نے لیمپ کو پرے کر دیا اور خود تنہا اندھیرے میں بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔

اس نے لڑکی کو چندن نگر جانے کی اجازت کیوں دے دی؟ کیوں! اس نے مکا اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا اگر اس وقت صرف وہ لڑکی ہی ریسٹ ہاؤس میں اس کے ساتھ ہوتی تو اسے کسی کی پرواہ نہ ہوتی چاہے باقی دنیا جہنم میں جائے۔ لیکن وہ یہاں نہیں تھی۔ وہ ٹرین میں تھی۔ یکدم اسے ٹرین کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ حکم چند کرسی پر لیٹ سا گیا۔ اپنا چہرہ بازوؤں سے چھپا کر رونے لگا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور دعا مانگنے لگا۔

○

رات گیارہ بجے کے بعد چاند نے اپنی تھوڑی سی جھلک دکھائی چاند بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی روشنی سے بند کے پانی میں طغیانی مچا دی۔ پل کے قریب چاند کی روشنی بہت مدہم تھی۔ ریلوے کی بڑی دیوار اندھیرے سائے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سگنل کے نزدیک ریت کی بوریاں مشین گن کی حفاظت کیلئے رکھی گئی تھیں۔ سگنل کی الو کی طرح کی دو آنکھیں۔ ایک دوسرے کے اوپر۔ سرخ ہو چکی تھیں۔ سگنل کے نزدیک دو ہاتھ ان کو ایک دوسرے کے متوازی کر رہے تھے۔ دریا کے کنارے کی جھاڑیاں جنگل جیسی محسوس ہو رہی تھیں۔ دریا چمک نہیں رہا تھا بلکہ دیکھنے میں کالی چادر سا محسوس ہو رہا تھا جس میں کبھی کبھی ادھر سے ادھر لہریں اٹھتی تھیں۔ دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے ایک جیپ آ کر رکی۔ اس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کچھ آدمی ریلوے لائن کے ساتھ ایک دوسرے سے چند فٹ کے فاصلے پر پٹڑی کے دونوں اطراف میں بیٹھ گئے۔ اور انہوں نے اپنی رائفل اور خنجر اپنی ٹانگوں کے درمیان رکھ لئے۔ ریلوے لائن کے اوپر رسی کو کس کر سیدھا باندھ دیا گیا۔ یہ پٹڑی سے تقریباً پچیس فٹ اونچی تھی۔ اندھیرا کافی تھا کہ ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔
تب ہی کسی نے کہا۔

خاموش ہو جاؤ! سنو۔

انہوں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن ادھر کچھ نہ تھا۔ صرف ہوا تھی۔

خاموش ہو جاؤ۔ لیڈر کی طرف سے حکم ہوا۔

اگر تم اس طرح سے باتیں کرو گے تو وقت پر ٹرین کی آواز نہ سن سکو گے۔

انہوں نے سرگوشی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔

جیسے ہی سگنل نیچے گرا لوہے کی رگڑ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ سگنل کی بیضوی آنکھیں سرخ سے سبز رنگ میں تبدیل ہو گئیں۔ سرگوشیاں رک گئیں۔ آدمی اٹھے اور انہوں نے پٹڑی سے دس گز کے فاصلے تک اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ رگڑ کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ ایک آدمی پٹڑی پر بھاگتا ہوا آیا۔ اور اپنے کان لوہے کی پٹڑی پر رکھ دیئے۔ واپس آ جاؤ۔ کیا تم پاگل ہو۔ لیڈر بھاری آواز

میں آہستہ سے چلایا۔ یہ ٹرین ہے' اس نے فتح و کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ جلدی واپس آؤ' لیڈر نے سختی سے کہا۔

سب کی آنکھیں سرمئی خلا میں گڑ گئیں' جہاں سے ٹرین کے آنے کی آواز آ رہی تھی۔ تب انہوں نے رسی کو اور کس کر لوہے کے تیر کی مانند بنا دیا۔ اگر ٹرین کی رفتار زیادہ ہو گی تو یہ بہت سے لوگوں کو چاقو کی طرح کم تکلیف دے کر دو حصوں میں تقسیم کر دے گی۔ وہ کانپ گئے۔

اسٹیشن سے دور پرے۔ روشنی کا نشان نظر آنے لگا۔ وہ دور چلی گئی اور کوئی اور قریب آتا گیا۔ تب وہ ٹرین کی طرح نزدیک سے نزدیک تر آتا چلا گیا۔ جھاڑی میں چھپے لوگوں نے روشنی کی طرف دیکھا اور ٹرین کے آنے کی آواز سنی۔ کوئی بھی دوبارہ پل کی طرف نہ دیکھ سکا۔

اس ایک آدمی نے لوہے کے پل کے درمیانی فاصلوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس آدمی کو اس وقت دیکھا جب وہ اس اونچائی تک پہنچا۔ جہاں سے رسی کس کر بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ وہ گرہ کو چیک کر رہا ہے۔ اور اسے مزید کس رہا ہے۔

رسی بہت اچھی طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ اگر انجن کی کیف اس سے ٹکرائی بھی تو رسی زور سے ٹوٹ تو سکے گی لیکن اس کی گرہ نہیں کھلے گی۔

اس آدمی نے اپنے آپ کو رسی پر لٹا دیا۔ اس کے پاؤں گرہ کے پاس تھے اور اس کے ہاتھ تقریباً رسی کے درمیان تک پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔

ٹرین قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ آسیب زدہ انجن کے کیف میں سے پٹڑی کے ساتھ ساتھ دھواں اور چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس کی پھولی ہوئی سانس کی آواز ٹرین کی گھن گرج چھک چھک میں گم ہو گئی تھی۔

چاند کی بے رونق روشنی میں پوری ٹرین صاف نظر آ رہی تھی۔ کوئلے کے انجن سے لیکر آخری ڈبے تک چھتوں پر انسانوں کا ایک جم غفیر تھا۔

آدمی ابھی تک رسی پر لیٹا ہوا تھا۔

سکھ نوجوان لیڈر اٹھ کھڑا ہوا اور جذبات میں آ کر چلایا۔

نیچے آ جاؤ۔ گدھے! تم مر جاؤ گے۔ فوراً نیچے آ جاؤ۔ آدمی نے آواز کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس نے اپنی کمر میں سے کرپان نکالی اور رسی کو کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ کون ہے؟ اور کیا کر رہا ہے؟

اب بالکل وقت نہ تھا۔ سکھ سردار اور سکھ رضا کار پل کے پاس سے ٹرین کو دیکھ رہے تھے۔ اور ٹرین پر سوار لوگ پل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس آدمی نے اور زور زور سے رسی کو کاٹنے کی کوشش کی۔

سکھ رہنما نے اپنی بندوق اپنے کاندھوں پر رکھی اور اس آدمی کا نشانہ لیکر گولی چلا دی۔ اس آدمی کی ٹانگیں رسی پر سے پھسل گئیں اور وہ ہوا میں لٹک گیا۔ لیکن اس کے جسم کا باقی حصہ ابھی بھی رسی کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ انجن اس سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ آسمان پر انگارے بکھیرتا ہوا اور ہر انگارہ دھماکے کی طرح آواز دیتا۔

کسی نے ایک اور گولی چلائی۔ آدمی کا جسم رسی پر سے لٹک گیا لیکن وہ اپنے ہاتھوں اور تھوڑی کے ساتھ رسی سے چپکا رہا۔

اس نے اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور اپنے بائیں بازو کے نیچے سے رسی کو کاٹا اور پھر دوبارہ اپنے دائیں ہاتھ سے رسی کو کاٹنا شروع کر دیا۔ رسی ٹکڑوں میں کٹ گئی۔ صرف ایک باریک سا ٹکڑا باقی رہ گیا تھا۔ اس نے باریک ٹکڑے کو دوبارہ اپنے چاقو سے کاٹنا شروع کر دیا۔ اور پھر تیزی سے اپنے دانتوں سے کاٹنے لگا۔ ریل گاڑی کا انجن اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

ادھر سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ آدمی نے تڑپنا شروع کر دیا اور دھڑام سے نیچے گر گیا۔ جیسے ہی وہ نیچے گرا رسی درمیان میں سے ٹوٹ گئی۔ ٹرین اس کے اوپر سے گزرتی ہوئی پاکستان کی طرف چل دی۔

O